معالم السبیل

شاکلۂ انسانی کی فطری تشکیل

ہم پر مشکلیں کیوں آتی ہیں؟

ساجد حمید

المورد

ہم پر مشکلیں کیوں آتی ہیں؟

تصنیف

ساجد حمید

المورد

۵۱ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

المورد

ناشر: المورد

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

طبع سوم: مارچ 2008ء

قیمت: 80 روپے

ISBN: 978-969-8799-26-7

المورد: K-51 ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 5834306, 5865145-042

ترتیب

دیباچہ ۷

اس ایڈیشن کے بارے میں ۹

باب اول

بنیادی باتیں ۱۱

باب دوم

مشکلات اوران کے اسباب ۳۳

باب سوم

مشکلات میں مطلوب رویے ۶۲

باب چہارم

آزمایش میں کامیابی کے ذرائع ۶۶

باب پنجم

مشکلات کے لیے دعائیں ۱۰۱

دیباچہ

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے، مگر ابلیس نے اپنی شرارت سے ابن آدم کو ہمیشہ گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ابن آدم کا علانیہ دشمن [عدو مبین] ہے۔ اس نے اپنا ہدف ہی یہ بنایا ہے کہ وہ اولادِ آدم کی راہ کھوٹی کرے، لیکن شیطان کی اس شر انگیزی سے اللہ کے وہ بندے ہمیشہ محفوظ رہے، جو اللہ سے ڈرنے والے تھے۔

اللہ کا ڈر اپنی حقیقی صورت میں ایسا نہیں ہے جیسا کسی آفت یا کسی سخت گیر بادشاہ کا ہو۔ یہ خوف اپنی شدت اور نرمی میں اس خوف سے بہت مختلف ہے۔ اس کا حقیقی شعور ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ صرف وہی لوگ اس خوف کا صحیح شعور پاتے ہیں، جو خدا کو صحیح معنی میں جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: 'اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا' (اللہ سے [حقیقی معنی میں] صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں، جو اس کو جاننے والے ہیں)۔

اللہ کو جاننا اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ جانا جائے کہ وہ اس دنیا کو کیسے چلاتا ہے؟ اس کے اصول کیا ہیں؟ وہ لوگوں کو آسانیاں کیوں دیتا ہے؟ ان پر مشکلیں کیوں اتارتا ہے؟ انھیں معاشرے میں بلند و پست مقام کیوں دلاتا ہے اور انھیں شاہ و گدا کیوں بناتا ہے؟ اس نے ہمیں اس دنیا میں کیوں بھیجا ہے؟ موت و حیات کا یہ سلسلہ کیا ہے؟ اور یہ کہ اللہ کی سنن کیا ہیں؟ اور وہ کن صفات سے متصف ہے؟

ان سوالوں کا جواب ہی وہ حقیقی علم ہے، جسے جاننے کے بعد آدمی اس دنیا میں جینے کے قابل ہوتا، ہونے والے ہر حادثے کی توجیہ کر سکتا اور اس سے نبرد آزما ہونے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس مختصر سے رسالے کا مقصد اسی علم کے ایک پہلو کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ہے تاکہ وہ اس آزمایش کی ہر چڑھائی اور ہر اترائی کو علیٰ وجہ البصیرت عبور کر سکیں۔ مشکلات میں خدا سے مایوس ہونے کے بجائے صحیح رخ پر آگے بڑھ سکیں تاکہ ہمارا 'علانیہ دشمن' ہماری راہ کھوٹی نہ کر سکے۔

دنیا میں رہنے کے لیے بہترین تعلیم یہ ہے کہ آدمی اپنے ساتھ ہونے والے ہر معاملے اور ہر

حادثے کی توجیہ کر سکے اور ہر حادثے کا سامنا کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا کرے۔ اسے اس کا صحت مند تجزیہ اور پھر اس کا حل اور تدارک کرنا سکھادے۔

وہ مشکلات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو جایا کرے، بلکہ ہر مشکل اس کے اندر وہ داعیات پیدا کر دے کہ وہ اس کا مواجہہ کر کے اس کے اندر سے اپنے لیے زادِ سفر پیدا کر لے۔ مشکلات اس کے لیے مایوسیاں لے کر نہ آئیں، بلکہ اسے خدا کے اور قریب کر دیں۔

یہ کتابچہ اسی تعلیم کا ایک ادنیٰ سا جز ہے، یہ انسان کے ذہن کی ایسی ہی تشکیل کے لیے ایک کوشش ہے۔ اس کا مقصدِ تحریر یہ ہے کہ ہر آدمی کے پاس وہ شاکلہ (مزاج اور طبیعت) آ جائے کہ جس کے تحت وہ اللہ کی اس دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے کہ ہمیں وہ شاکلہ (nature or frame of mind) میسر آ جائے، جسے وہ نفسِ مزکی قرار دے کر ہمیں جنت میں داخل کر دے۔ آمین

فلسفہ کے طالب علموں کے لیے بھی یہ ایک مفید علم ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ یہ جان سکتے ہیں کہ منبعِ خیر اس دنیا میں شر کیوں پیدا ہونے دیتا ہے۔ وہ یہ بھی جان سکتے ہیں کہ اس صاحبِ خیر نے اس شر کو جو انسان کے اختیار و ارادہ کے غلط استعمال سے پیدا ہوتا ہے، کس طرح خیر کا خادم بنا لیا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

معالم السبیل کے نام سے اس سلسلۂ تصانیف کا آغاز میں نے اپنی خانقاہ کی علمی ضرورتوں کے لیے کیا ہے، جس سے انسانی مزاج و نفسیات (شاکلہ) کی تربیت و اصلاح مقصود ہے۔ اس کی طباعت کے لیے میں "المورد" کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری اس تحریر کو شائع کرنے کے لیے قبول کیا۔

اس کتابچے کے تمام مباحث کا علم اللہ کی بے پایاں عنایت اور استاذِ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کی اس تربیت کا ثمرہ ہے، جو انھوں نے ہماری قرآن فہمی کے باب میں کی ہے۔ اللہ ان کے سایے کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے، آمین۔

ساجد حمید

۲ جولائی ۱۹۹۹

اس ایڈیشن کے بارے میں

یہ اس کتاب کا تیسرا، مگر حقیقت میں دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے، اس میں بہت سی تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں۔ جب سے اس کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا تھا، تب سے ایک کمی اس کتاب میں یہ محسوس ہوتی تھی کہ مشکلات کے موقع پر پڑھنے کی دعائیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس ایڈیشن میں یہ کمی پوری کر دی گئی ہے۔ بہت سے مباحث میں تفصیلات کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے نفس مضمون کو سمجھنے میں بہتری آئے گی۔ کئی فصول بالکل نئی شامل ہوئی ہیں۔ اسی طرح مباحث کی ترتیب بھی بدل دی گئی ہے۔

دسمبر ۲۰۰۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اول

بنیادی باتیں

مشکلات کے اسباب وعلل (causes) کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند بنیادی باتوں کو سمجھ لیں تا کہ ہم ان اسباب کی حقیقت تک پہنچ سکیں اور مشکلات میں مایوسیوں کا شکار ہونے کے بجائے صبر واستقامت سے ان کا مقابلہ کرسکیں۔

دنیا کی حقیقت

یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ اسے اس نے ایک خاص مقصد سے بنایا ہے۔ اس کی ساخت اور اس کا نظام، دونوں انسان کی آزمایش کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ اس لیے اس کے نظام اور ساخت میں ایسی چیزیں رکھ دی گئی ہیں جو ہمارے لیے امتحان کی صورت پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اس میں آسانیوں اور مشکلوں کا ایک طویل اور مسلسل سلسلہ رکھ دیا گیا ہے۔ جو دو طرف سے ہمارا امتحان کرتا رہتا ہے۔ دو رخا امتحان عمل اور ردعمل کی جانچ کے لیے ہے۔ مثلاً نعمتیں اس لیے دیں کہ آدمی نعمت پا کر کیا کرتا ہے۔ محروم اس لیے رکھا کہ وہ ردعمل میں کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ سو یہ امتحان اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ ہمیں آزمائے کہ اس دنیا میں آ کر ہم کیسا عمل کرتے ہیں، اچھا کرتے ہیں یا برا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت وحیات کا یہ سلسلہ اسی لیے چلایا ہے، جسے خود اس نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ ''وہ ذات جس نے موت اور حیات کو بنایا

اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ. (الملک ۶۷:۲) تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں اچھا ہے۔ اور وہ عزیز وغفور ہے۔"

جو شخص اس دنیا کو کسی اور نگاہ سے دیکھے گا وہ اس میں پریشان رہے گا، کیونکہ اس کے وہ پتے لازماً ہوا دیتے ہیں جن پر وہ تکیہ کرتا ہے۔ اس کی تعمیر استحکام اور رعنائی میں کیسی ہی کیوں نہ ہو اس میں خرابی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور موجود رہے گی۔ بقول شاعر:

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

لیکن جو شخص اس کی اس حقیقت کو جان لے گا، اس کے لیے یہ ایک فطری معاملہ بن جائے گا۔ جس طرح ہر کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اسی طرح آزمایش کے لیے بنائی گئی اس دنیا میں خوشیوں کے ساتھ ساتھ مقامات آزمایش بھی ہوں گے۔ یہ مقصد آزمایش کا لازمی تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں غم اور خوشی، خوش حالی و بدحالی، بھوک و سیری، عزت و ننگ ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ دنیا آزمایش کے لیے موزوں نہ ہوتی۔ چنانچہ وہ شخص جسے یہ بات معلوم نہ ہو یا وہ فراموش کر بیٹھا ہو، اس کے لیے پھر مشکلات خدا سے ناراضی یا اس کی موجودگی سے انکار تک لے جاتی ہیں۔ جبکہ اس بات سے واقف شخص اس بات کو سمجھتا ہے اور وہ ہر مشکل کو صحیح رخ سے دیکھ کر اس کا مواجہہ (face) کرتا ہے، اور وہ اس دنیا اور اس کے بنانے والے کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا۔ مومنین کی یہ صفت کہ وہ کائنات کے اسی پہلو پر جب غور کر کے پہنچتے ہیں تو ان کے اندر کیا بصیرت (insight) پیدا ہوتی ہے، وہ سورہ آل عمران کی آیات ذیل میں بیان کی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (۳:۱۹۱)

"وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اور کائنات کی تخلیق میں غور کرتے ہیں، وہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اے اللہ، تو نے یہ دنیا بے مقصد نہیں بنائی، (بلکہ امتحان کے لیے بنائی ہے۔ اس

لیے کہ تو لغو اور بے مقصد کام کرنے سے)
پاک ہے۔(اس لیے ہمیں اس امتحان کے
برے نتیجے سے بچا اور) دوزخ سے ہمیں
نجات دے۔''

دنیا کی وقعت

دنیا کی نعمتیں جن کے ملنے پر ہم خوش ہوتے اور جن کے چھن جانے پر یا محروم رہ جانے پر ہم پریشان ہوتے ہیں، ان کی وقعت (value) کو دنیا کی حقیقت کے لحاظ سے متعین کرنا چاہیے۔دنیا کی حقیقت یہی ہے کہ یہ جنت اور دوزخ میں جانے کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔اس اعتبار سے اس دنیا کی نعمتوں کی اصل حیثیت امتحانی سوالات کی ہے، نہ کہ مال و منال کی۔آخرت کے لحاظ سے بھی اس کی حیثیت کچھ زیادہ نہیں ہے۔یہ دنیا عارضی ہے۔ہاتھ میں آ جائے تو تب بھی نہ آنے کے برابر ہے۔اس لیے کہ جب موت کا سایہ اس پر منڈلا رہا ہے تو یہ سب کچھ چھن جانے والا ہے۔اس آدمی کے اوپر ہم ہنستے ہیں جو پوری محنت سے ایسی چیز حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو جو ہاتھ میں آ کر ضائع ہو جانے والی ہو۔آخرت ابدی ہے، جس کو مل گئی کبھی چھینی نہ جائے گی۔اس اعتبار سے دیکھیں تو دنیا کی نعمتیں بس ایک تماشا اور کھیل ہی لگتی ہیں۔یہی بات ہے جو قرآن مجید نے انھی الفاظ میں بیان کی ہے کہ:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (انعام ۶:۳۲)

''یہ دنیا کی زندگی تو بس ایک کھیل اور تفریح سی ہے۔جبکہ آخرت کا گھر متقی لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔تم (اس فرق کو) کیوں نہیں سمجھتے؟''

یہی وجہ ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی نعمتیں مال اولاد وغیرہ انسان کے لیے رکاوٹ بنتی ہیں تو قرآن مجید انھیں انسان کے لیے فتنہ قرار دیتا ہے۔یعنی ایسی چیزیں جو انسان کو غافل

کر کے کسی مصیبت میں پھنسا دیں:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ.
(الانفال ۸:۲۸)

''جان لو کہ یہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک فتنہ (اور سامانِ آزمایش) ہے۔ اللہ کے پاس (اس آزمایش میں کامیاب ہونے پر) ایک بہت ہی بڑا اجر ہے۔''

دنیا کی مقصدیت

یہ دنیا ایک مقصد کے ساتھ بنی ہے اور اس کا یہ مقصد اس میں پیش آنے والے کسی حادثے اور واقعے (event) میں جدا نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیق، اس کے روز و شب کے معاملات، اس کی الٹ پھیر، اس میں عروج و زوال، اس میں شکست و تعمیر ہر جگہ اگر کوئی اصول اصلاً کارفرما ہے تو وہ اس کا وہ مقصد ہے جس کا ذکر ہم اوپر سے کرتے آئے ہیں۔ یہ دنیا اسی ہدف کے لیے بنی ہے۔ اس کا ایک حرفی ایجنڈا ہے اور وہ یہی ہے کہ یہ دنیا انسان کی آزمایش کے لیے بنی ہے۔ اوپر ہم سورۂ ملک کا حوالہ دے آئے ہیں۔ خدا اس ہدف کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ ہر چیز اسی حساب میں ظاہر ہوتی ہے اور اسی کے لحاظ سے ہمارا امتحان لیتی اور نتیجہ لکھ کر فارغ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس میں کارفرما یہ اصول اس کی ہر مصیبت کی اولین اور صحیح تر توجیہ ہے۔

اللہ ہمارا دشمن نہیں

جب یہ بات واضح ہو کہ یہ دنیا آزمایش کے لیے بنی ہے تو اس میں آسانیاں بھی آئیں گی اور مشکلات بھی۔ اور یہ بھی لازم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جب ہم پر مشکلات نازل فرماتے ہیں تو وہ ایسا ہماری دشمنی میں نہیں کرتے، بلکہ ان مشکلات کے پیچھے اصل سبب آزمایش ہے۔ اچھا برا جو کچھ ہم پر نازل ہوتا ہے، وہ دراصل ہمارے امتحان کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بات بھی لازم ہو گی کہ آزمایش جتنی مشکل ہو گی، اس میں سے کامیاب ہونے والے کو اتنا ہی بڑا انعام ملے گا۔

اس نے اپنے آپ کو ہمارا دوست قرار دیا ہے، اور خیر خواہ دوستوں کی طرح ہمارے ازلی دشمن سے بھی ہمیں خوب اچھی طرح متعارف کرا دیا ہے تا کہ ہم اس کے دکھائے ہوئے سبز باغوں کے فریب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اسی طرح یہ بھی اللہ نے اپنی کتابوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ ایسا نہیں ہے کہ موقع دیے بغیر آخری اقدام کر دے۔ اللہ اپنے بارے میں خود فرماتا ہے کہ وہ اگر ہر غلطی پر پکڑنے لگتا تو زمین پر کوئی متنفس باقی نہ رہتا۔ اس لیے اس نے مہلت اور توفیق کا قانون جاری کر رکھا ہے کہ وہ ہر خطا کار کو برائی پر مہلت دیتا اور توبہ کرنے کا موقع عطا کرتا ہے تا کہ آدمی غلطی کرتے ہی پکڑ کے عذاب میں مبتلا نہ کر دیا جائے۔

اللہ ہمارا خیر خواہ دوست ہے، مگر وہ ایسا دوست نہیں ہے کہ ہم جہالت سے کام لیں تب بھی وہ اندھی دوستی کرے گا، اور جہالت میں بھی ہمارا ساتھ دے گا۔ وہ ہمارا مخلص دوست ہے، اس لیے وہ ہماری جہالت اور حماقت میں ہمارا ساتھ دینے کے بجائے، ہمیں ان سے نکالنے کے درپے رہتا ہے۔ اس کے لیے نبیوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی اس دنیا میں عسر و یسر (غمی و خوشی) کا ایسا ضابطہ بھی جاری کر رکھا ہے کہ جو ہمارے ایک ہمدرد ساتھی کی طرح شب و روز ہمارے ساتھ لگ کر ہمیں راستہ دکھاتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ویسا بھی نہیں ہے جیسا کہ یہود نے خیال کیا کہ وہ اپنے چہیتے لوگوں (chosen people) کے ساتھ انصاف کے برخلاف نرمی کرے گا، خواہ وہ چہیتے کچھ بھی کر لیں۔ یہود اپنے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ ہم چونکہ اللہ کے برگزیدہ انبیا کی اولاد ہیں، اس لیے جو چاہیں کریں، وہ ہمیں دوزخ میں نہیں ڈالے گا اور اگر ڈال بھی دیا تو بس چند دن کے لیے ڈالے گا۔ خدا کے بارے میں ایسے باطل نظریات رکھنے کو اللہ تعالیٰ نے 'الحاد فی الاسماء' کہا ہے اور اسے قابل سزا جرم قرار دیا ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا	''اللہ ہی کے لیے ہیں اچھے نام و اوصاف،
وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ	تو تم اللہ کو انھی ناموں سے پکارا کرو۔ اور ان
سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.	کو چھوڑ دو جو اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے

ہیں۔عنقریب ان کو ان کے کیے کی جزا دی جائے گی۔" (الاعراف ۷:۱۸۰)

قرآن مجید نے مختلف پیرایوں (wording) میں یہ واضح کیا ہے کہ اسے تمام صفات کے ساتھ مانا جائے۔اس کی صفات میں الٹ پھیر یا بعض کو ماننا اور بعض کو فراموش یا رد کرنا غلط ہے۔

اللہ ہماری قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا

دوسرا اصول اس موقع پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر دین وشریعت میں اتنا ہی بوجھ ڈالتے ہیں، جتنا ہم اٹھا سکیں۔یعنی ان کی شدت کبھی اتنی نہیں ہوتی کہ ہمارے ایمان ضائع ہو کر رہ جائیں۔اس کو قرآن نے اپنی لاہوتی زبان میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ 'لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'، "ہم کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے" (البقرہ ۲:۲۸۶)۔ظاہر ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آزمایش کا سارا ضابطہ ظالمانہ بن جاتا۔

شریعت کے لیے اللہ نے جب اس اصول کو اختیار کیا ہے تو ہم اس سے قیاس کر سکتے ہیں کہ عام آزمایشوں کے لیے بھی اللہ کا اصول یقیناً ایسا ہو گا۔اس لیے کہ یہ بات اس کی صفات عدل و رافت کے خلاف ہے کہ وہ ہماری ہمتیں شکستہ کرنے کے لیے آزمایشوں میں مبتلا کرے۔اس لیے بڑی سے بڑی مشکل میں بھی اللہ تعالیٰ صرف ہماری آزمایش کرتے ہیں۔اس سے اللہ کا مقصود ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں ہماری ہمت سے زیادہ مشکل میں ڈال کر تنگ کریں۔

ہمت سے کیا مراد ہے، اسے سمجھ لینا چاہیے۔ہمت سے مراد اٹھانے کی قوت نہیں، بلکہ مشکلات میں ایمان بچا لینے کی ہمت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی آزمایش میں اول تو مبتلا نہیں کرے گا کہ جس کی صرف سختی ہی، ہماری ثابت قدمی کے باوجود، غارت گر ایمان ہو۔اگر وہ کوئی ایسی سختی ڈالتا بھی ہے تو پھر اس میں لازم ہو گا کہ وہ پھر ہمارے امتحان کے لیے نہ ہو۔

اگر کوئی ایسی سختی ہم پر آئے تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں:

اول یہ کہ اگر وہ آزمایش ہماری زندگی ختم کرنے کے لیے نہیں آئی تو اس میں ناکام ہونے کی

صورت میں ہمارا مواخذہ نہیں ہوگا۔ ایک مصیبت جان لے سکتی ہے، ہمیں رلا سکتی ہے، ہماری نیندیں اڑا سکتی ہے، لیکن اگر وہ مصیبت اتنی بڑی ہے کہ ہم ساری توانائیاں لگا کر بھی اپنا ایمان نہیں بچا سکے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آزمایش ہمارے امتحان کے لیے نہیں، بلکہ کسی اور ہی مقصد کے لیے آئی ہے۔ اس لیے اس میں ناکامی پر سزا نہیں ہوگی۔

دوم یہ کہ اللہ کی طرف سے آزمایش کی مہلت ختم ہو جائے اور کسی کو سزا دینے کے لیے مشکل آ جائے۔ اس کی مثال رسولوں کی اقوام کا عذاب ہے۔ جیسے قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط کی تباہی کا عذاب وغیرہ۔

مشکلات ہمارا ایمان چھیننے نہیں آتیں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اوپر والے اصول ہی کا ایک نتیجہ اصول کے طور پر یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین و دنیا میں ہم پر جو بھی آزمایش ڈالتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان مشکلات میں ڈال کر ہمیں ہمارے ایمان سے محروم کر دیں، بلکہ اس کی ہر آزمایش اتنی ہی آتی ہے جتنی ہمارے ایمان کو برباد کرنے والی نہ ہو۔ جیسا کہ تحویل قبلہ کے وقت یہود اور مسلمانوں سے یہ کہا کہ ہم نے یہ حکم اس لیے نہیں دیا کہ اللہ تمھارے ایمان ضائع کرنا چاہتا تھا۔ قرآن مجید نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيمَانَكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيمٌ.	''اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمھارے ایمان ضائع کرنا چاہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں
(البقرہ ۲: ۱۴۳)	پر بہت مہربان و رحیم ہے۔''

ہم نے اوپر یہ بیان کیا تھا کہ ہمت سے مراد ایمان ہی ہے۔ ایسی مشقت و مصیبت دنیا میں ہوتے ہوئے ہم پر نہیں آئے گی، جو ہمارے ایمان کو بچانے کے لیے ہماری قوتوں سے بڑھ کر ہو۔

مشکلات میں مہربانی

تیسری بات یہ واضح رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر جتنی بھی مشکلیں ڈالتے ہیں تو وہ محض مشکلات

نہیں ہوتیں، بلکہ وہ اپنی جلو میں بہت سی نعمتیں لے کر آتی ہیں۔کبھی یہ نعمتیں مشکلات کے ساتھ ساتھ حاصل ہو رہی ہوتی ہیں اور کبھی مشکلات کے جانے کے بعد۔اسی طرح جتنی بھی مشکلیں ہیں، وہ اپنی ذات میں بھی مہربانی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے یہ دنیا اضداد کے جوڑوں سے استوار کی ہے۔ہر چیز میں یہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔رات کے بغیر دن کا تصور بے معنی ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے۔ٹھیک اسی طرح بے شمار آسانیاں ایسی ہیں کہ مشکلات کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے۔مثلاً ایک عورت بے پناہ تکلیف کے بعد اولاد کی نعمت پاتی ہے۔طالب علم طویل عرصے کی محنت شاقہ کے بعد تعلیمی سند حاصل کرتا ہے۔داعی طویل جدوجہد کے بعد اپنی دعوت کو عام کر پاتا ہے۔اسی طرح کی سخت آزمایشوں کے بعد ہی آدمی جنتی بنتا ہے۔قرآن مجید نے کہا ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یونہی جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، جبکہ ان پر ابھی وہ آزمایشیں نہیں آئیں جو پہلے انبیا پر اور ان کے صحابہ پر آئیں جن سے وہ ہلا مارے گئے اور پکار اٹھے کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی؟

اسی طرح اللہ کی حکمت بالغہ ہی کے تحت اس دنیا کی ہر چیز اپنے اندر کم از کم دو پہلو رکھتی ہے، ایک ہی چیز فائدہ مند بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ایک ہی چیز تکلیف بھی دیتی ہے اور آرام بھی۔ آگے چل کر ہم یہ سمجھیں گے کہ کس طرح خود ایک مشکل ہی ہمارے لیے فائدہ مند بن جاتی ہے۔ جس طرح ایک سرجری کا تکلیف دہ عمل ہمارے جسم کو بیماری سے پاک کر دیتا ہے، اسی طرح مشکلیں بھی ایک سرجری والا آپریشن ہی ہیں، جو ہمارے اندر کے میل کچیل اور خرابیوں کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں۔

چنانچہ خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اصول یہ ہے کہ ایک خوبی پیدا کرنے کے لیے اور کوئی نعمت عطا کرنے کے لیے وہ مشکلات سے آدمی کو گزارتا ہے۔اور اس طرح کی ہر مشکل اور آسانی میں دراصل مومن کے لیے آسانی ہی ہے۔ایک حدیث مبارکہ میں اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان کیا ہے کہ:

لا یقضی اللّٰہ قضاء للعبد الا کان خیرا لہ. (صحیح ابن حبان، رقم ۷۲۸)	''اللہ اپنے بندے کے لیے جو بھی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔''

مشکلات کے اچھا ہونے کے بہت سے پہلو قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ یہاں بطور وضاحت محض ایک حوالہ پر اکتفا کر رہا ہوں، کیونکہ یہ ساری کتاب اسی موضوع پر ہے۔ اس کے دیگر مختلف پہلو آگے بیان ہو ہی جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

عجبا لأمر المومن، ان امرہ کلہ خیر... ان اصابتہ سرّاء، شکر، فکان خیرا لہ. وان اصابتہ ضرّاء، صبر، فکان خیرا لہ. (صحیح مسلم، رقم ۲۹۹۹)	''بندۂ مومن کا معاملہ بھی حیرت انگیز ہے۔ اس کے لیے وہ سب اچھا ہے۔ اگر اسے خوشی لاحق ہو، اور وہ شکر گزار بنے تو یہ بھی اس کے لیے اچھا ہوا۔ اور اگر اس پر مصیبت نازل ہو، اور وہ اس میں صبر کرے، تو یہ بھی اس کے بھلے میں رہا۔''

اللہ تعالیٰ کی آزمایش میں مدد

چوتھی بات جو ذہن نشین رہنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمایش میں ڈال کر بھول نہیں جاتا، بلکہ ان پر پوری توجہ رکھتا ہے۔ ان کی مدد کے لیے اپنے سارے لشکروں کے ساتھ آتا ہے۔ سیدنا یوسف پر جب زلیخا ڈورے ڈالتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی برہان کے ساتھ ان کی مدد کرتا ہے۔ ٹھیک اسی اصول پر وہ اپنے ہر بندے کو آزمایش میں ڈال کر ان کی مدد کرتا ہے، لیکن اس کی یہ مدد مشروط ہے کہ بندہ خود اس آزمایش میں کامیاب ہونا چاہتا ہو۔ وہ پورے ارادے اور ہمت کے ساتھ آزمایش کا سامنا کرے تو تبھی اللہ کی مدد آتی ہے اور اللہ کے بندوں کے دین و ایمان بچا لیتی ہے۔ اور اگر آزمایش بڑی ہو، اور آدمی اس کا سامنا اس حوصلے اور شان کے ساتھ کرے کہ جو اولوالعزم لوگوں کا شیوہ ہے تو پھر اس کی نصرت وہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں سے آدمی گمان بھی نہیں کر سکتا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی والدہ ماجدہ کے دل کا حال بتایا کہ جب انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو پانی کی موجوں کے حوالے کیا تو ان پر کیا بیتی۔ اگر وہ اس وقت نہ سنبھل پاتیں تو حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل میں سے ہونے کا راز کھل جاتا اور وہ مار دیے جاتے۔ اللہ نے اس وقت انھیں سنبھالا دیا اور دیکھیے کہ اس کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بتایا کہ اللہ نے انھیں اس لیے سنبھالا دیا کہ وہ حالتِ ایمان پر قائم رہیں۔ (القصص ۲۸:۱۰)

سورۂ فتح میں قرآن مجید نے دشمنوں کے مقابلے میں جب مدد کا وعدہ کیا تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اپنے بندوں پر قلبی سکون نازل کرتا ہے تا کہ ان کا ایمان بڑھ جائے اور وہ جنگ کی اس مشکل میں ایمان اور صبر پر قائم رہیں:

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ. (۴۸:۴)

''وہ ذات وہ ہے کہ (ایسے مشکل مواقع پر) مومنین کے دل میں سکون نازل کرتی ہے تا کہ ان کے ایمان پر مزید ایمان بڑھ جائے۔''

آزمانے میں اللہ کی کرم نوازی

آدمی خطاؤں پر خطائیں کرتا چلا جاتا ہے اور وہ ذات کریم اس کی پردہ پوشی فرماتی رہتی ہے۔ چھوٹی موٹی گرفت کر کے اسے غلطی کا احساس بھی دلاتی رہتی ہے اور کبھی کبھی اس کی خطاؤں سے تھوڑا سا پردہ اٹھا کر اسے یہ سبق دیتی ہے کہ اس سے باز آ جاؤ۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اگر آدمی توبہ کرنے والا ہو تو ان گرفتوں پر بیدار ہو کر توبہ کرتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بندے کے اخلاص اور اصلاح کی نیت کے مطابق قبول فرماتے رہتے ہیں۔

لیکن اگر آدمی توبہ کرنے والا نہ ہو۔ اللہ کی طرف سے کی گئی ہر گرفت اسے برائی ہی کی طرف لے جاتی ہو، تو ایسے آدمی کو اللہ مہلت دیتے ہیں۔ مہلت میں دونوں پہلو ہوتے ہیں کہ اگر توبہ کرنا چاہے تو واپس آ جائے اور اگر گناہ میں آگے بڑھنا چاہے تو آگے بڑھتا جائے۔ گناہ میں آگے

بڑھنے کی ایک اجل اور حد متعین ہے۔ اگر آدمی اس حد اور اجل کو عبور کر لے تو آدمی کے دل، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگ جاتی ہے کہ پھر حق اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، لیکن اس حد سے پہلے اللہ تعالیٰ آخری درجے کی سختی ظاہر نہیں کرتے۔ ان کی کرم نوازی جاری وساری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ دلوں پر مہر لگنے سے پہلے تک بھی اگر آدمی خلوص کے ساتھ توبہ کر لے تو اس کی رحمت کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔

یہ بات بھی معلوم رہے کہ دل پر مہر لگنے کا معاملہ چشم زدن میں نہیں ہوتا۔ اللہ پورے حلم وعفو کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے۔ آدمی کے حالات اس کی مجبوریوں، اس کی ہمتوں کی وسعت اور اس کے ماحول کی کارفرمائیوں کو سامنے رکھ کر حق اور انصاف کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ ایسا نہیں کرتا کہ بس اس نے شریعت و اخلاق کی ایک خلاف ورزی کر لی ہے تو اب بچ کر کہاں جائے گا، بلکہ جس قدر کسی کے حالات میں خرابی ہوگی، گناہوں میں بھی اس کے حالات کا خیال رکھا جاتا ہے اور ختم قلوب کے فیصلے کو نافذ کرتے وقت بھی اس کے حالات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

آزمائش لازم ہے

یہ دنیا اللہ نے اس لیے بنائی ہے کہ ہم راہ حق پر چلتے ہوئے جنت کی منزل کو پائیں۔ اس لیے ہماری زندگی قطعاً آزمائشوں سے خالی نہیں ہوسکتی۔ آزمائشیں ہمیں جنت میں لے جانے کے لیے آتی ہیں۔ یہ وہ امتحانی پرچہ ہے جسے اگر ہم حل کر کے نہ دیں تو ہم ناکام ہوجائیں گے۔

اس دنیا میں رہنے والا کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اسے آزمایا نہیں جائے گا۔ یہ اس کے مقصد پیدائش کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اسے پیدا اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ امتحان دے کر اپنے آپ کو کامیاب اور بہتر عمل والا ثابت کرے۔ اگر وہ اس امتحان میں سے بھاگنے کی سعی کرے گا تو یہ بھاگنا بھی اس کی ناکامی پر منتج ہوگا۔

ہم درحقیقت اللہ کی بسائی ہوئی اس دنیا میں رہ رہے ہیں۔ اس میں اسی کا قانون چلے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ کی دنیا میں آپ اپنی پسند کا ضابطہ بنا کر رہنے لگیں۔ ایک امریکی اگر پاکستان

میں آئے تو اسے پاکستان کے قوانین کے مطابق رہنا ہوگا۔ اور اسی طرح ایک پاکستانی اگر امریکہ جائے تو اسے امریکہ کے قانون کی پیروی کرنا ہوگی۔ ٹھیک ہمارا معاملہ اس دنیا میں بھی ایسا ہے۔ ہم امریکہ میں ہوں یا پاکستان میں ہر صورت میں ہم دراصل اللہ کے ملک میں رہ رہے ہیں۔ اور اللہ نے یہ ملک رہنے کے لیے نہیں، بلکہ آزمانے کے لیے بنایا ہے۔ اس ملک کا قانون یہی ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرُ ۙ. الَّـذِىْ خَلَقَ الْـمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ. (الملک ۶۷:۱-۲)

''بہت ہی فیض رساں ہے وہ ذات جس کے قبضے میں (اس ملک) کی بادشاہی ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرنے پر قادر ہے۔ وہ ذات وہ ہے جس نے موت اور حیات کو بنایا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں اچھا ہے۔ اور وہ عزیز وغفور ہے۔''

اس لیے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس حقیقت کو مان کر چلیں کہ یہ دنیا اللہ کا ملک ہے اور اس نے اسے ہمارے امتحان کے لیے بنایا ہے۔ یہ دنیا یوں ہی ہے اور ہمیں اسے یوں ہی قبول کرنا ہوگا۔ وگرنہ اس کا یہ جبر کہ ہم امتحان میں ڈالے گئے ہیں، ہمیں خواہ مخواہ اور گاہے بگاہے ستائے گا۔ ہم اپنے آپ کو اس سے آزاد کرنا چاہیں گے، مگر حقیقت میں ہر شکست اور ناکامی ہمیں اسی جگہ (امتحان کے دروازے پر) ہانک لائے گی۔ ہر خوشی اور ہر راحت امتحان ہی کا راگ الاپے گی۔ یہاں تک کہ ادھر بچہ دنیا میں آتا ہے اور ادھر یہ حقیقی سفر شروع ہو جاتا ہے کہ:

يٰـاَيُّهَـا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ. (الانشقاق ۸۴:۶)

''اے انسان، تو اپنے رب کی طرف کشاں کشاں کھچا چلا جا رہا ہے پھر تیری اس سے ملاقات ہوگی۔''

اسی لیے اس صورت حال سے ہم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ ہمیں ہر وقت مشکل اور آسانی کے نزول کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ تیاری ہماری تکلیفوں میں راحت کا ذریعہ بنے گی۔ اور اگر راحت نہ بھی ملے تو مشکل کو قدرے کم مشکل کر دے گی۔

۸۵۲۷۶

مشکلات: نیک و بد ہونے کا معیار؟

ہمارے ہاں یہ بات جاہلی معاشروں کی طرح غلط رائج ہوگئی ہے کہ اللہ جن کو دیتا ہے، اس لیے دیتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے رشوت خور اور اسمگلر اس خیال سے اپنے محلات پر 'هذا من فضل ربي' کندہ کرالیتے ہیں کہ یہ سب میرے اوپر میرے رب کا فضل ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔

غربت و امارت، دونوں اللہ کی آزمایشیں ہیں۔ کچھ کو اللہ دے کر آزماتا ہے اور کچھ کو محروم رکھ کر یا دی ہوئی نعمتیں چھین کر، دونوں سے اللہ ناراض نہیں ہوتا، بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ جس پر اللہ کی کوئی آزمایش نہ آتی ہو، اللہ اس سے ناراض ہو۔ وہ قارون کی طرح کے بڑے خزانوں کا مالک ہو لیکن حقیقت میں اللہ کے ہاں وہ ناپسندیدہ شخص ہو، اور اس نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرلیا ہو کہ وہ اسے دنیا ہی میں سب کچھ دے دلا کر فارغ کردے اور آخرت میں بس دوزخ ہی اس کا ٹھکانا بنے۔

ٹھیک اسی طرح آزمایشوں کا تسلسل اس بات کا زیادہ امکان رکھتا ہے کہ جو شخص ان کا نشانہ بنا ہوا ہے، وہ اپنے دین و اخلاق میں اللہ کو پسند ہے اور اللہ اسے یہاں دنیا ہی میں گناہوں سے دھو کر جنت میں لے جانا چاہتا ہے، لیکن ظاہر ہے، یہ آدمی کی نیکی، اس کی انابت اور رجوع کے ساتھ مشروط ہے۔ نیک لوگوں پر مصائب و مشکلات کا آنا کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے حالات اس بات کی گواہی کے لیے کافی ہیں۔ نیک لوگوں پر مشکل آنے کے معاملے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

ان اللّٰه اذا احب قوما ابتلاهم، فمن رضي فله الرضا، و من سخط فله السخط. (سنن ابن ماجہ، رقم ۴۰۳۱)	”بے شک اللہ جن لوگوں کو پسند کرتا ہے، انھیں ابتلا میں ڈالتا ہے، سو جو اس کی ابتلا پر بھی اس سے راضی رہتا ہے تو اللہ اس کو اپنی رضوان عطا کرتا ہے، اور جو اس ابتلا پر اللہ

سے ناراض ہو جائے، اللہ اس سے راضی
نہیں رہتا۔"

کثرت دولت: ایک انتباہ

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غربت اتنی خطرناک نہیں ہے، جتنی ثروت۔ مال و دولت ایک طرف آسانی لاتے ہیں، اور دوسری طرف یہ ایک انتباہ (alarm) بھی ہے۔ اس بات کا انتباہ کہ کہیں اللہ ہم سے ناراض نہ ہو گیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان لوگوں میں شمار نہ کرلیا ہو جو صرف دنیا کے طالب ہیں اور آخرت کو فراموش کر چکے ہیں، کیونکہ ایسے لوگوں کو اللہ دنیا ہی میں ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ دے دیتے ہیں، اور آخرت میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں یہ بات پوری طرح وضاحت سے یوں بیان ہوئی ہے کہ:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

(ہود ۱۱:۱۵)

"جس نے صرف دنیا ہی کی زندگی اور اس کی زینت (نعمتوں اور شان و شوکت) کو چاہا تو ہم دنیا ہی میں ان کے عملوں کا اجر پورا پورا انھیں دے دیں گے، اور اس میں ان کے لیے ذرا بھی کمی نہ کریں گے۔ یہی لوگ ہیں جن کا آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا، دنیا میں جو نیکیاں انھوں نے کی ہوں گی وہ حبط ہو جائیں گی اور ان کے اعمال اکارت جائیں گے۔"

اس آیت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ صرف دنیا کے طالبوں کے لیے یہی دنیا اجر کی جگہ ہے۔ آخرت میں ان کے لیے آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس بات کے سامنے آنے کے بعد یہ نتیجہ

خود بخود نکل رہا ہے کہ جس آدمی کو دنیا ملی ہو، وہ اس بات کو ضرور دیکھ لے کہ کہیں اس کی تمناؤں میں سے آخرت نکل تو نہیں چکی ہے۔ اس کی تگ و دو کا ہدف کہیں صرف دنیا ہی تو نہیں بن گئی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اسے دنیا میں قارون اور فرعون بنا کر دے دلا دے۔ سو نعمتیں اس اللہ کی رضا کی علامت نہیں، بلکہ یہ دو قسم کی ہیں:

ایک یہ کہ عام حالات میں یہ امتحان کے لیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ طالب دنیا کے لیے اس کے اعمال کا اجر ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس کے پیچھے ایک اور اصول بھی کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ برے لوگوں کو اگر اللہ مالی رفاہیت ہی سے نوازتا تو لوگ برائی ہی کی روش کو اختیار کر لیتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کے اجر کے لیے صرف مالی خوشحالی کو اجر نہیں بنایا، بلکہ دوسری چیزیں بھی ان کا اجر ہوتی ہیں، دنیا کی لذتیں، جاہ، شہرت، عزت اور دیگر چیزوں کی صورت میں ان کو اجر دے دیا جاتا ہے تاکہ سارے کے سارے لوگ برائی کا مالی رفاہیت والا نتیجہ دیکھ کر برائی کی طرف نہ چل پڑیں۔ سورۂ زخرف میں ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ. (۴۳:۳۳)	''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں، ہم ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی کر دیتے جن پر وہ چڑھتے۔''

ایسا اس لیے کر دیا جاتا تاکہ وہ اپنی کرتوتوں کی بنا پر اس کفر کی راہ پر جمے رہتے اور قرار واقعی سزا پاتے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ	''آپ کو ان کا مال اور اولاد حیرت میں نہ ڈالے، (یہ سب دے کر) اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے انھیں دنیا کی سزا

كٰفِرُوْنَ. (التوبہ۹:۵۵)

کے لیے پکڑیں اوران کی جان اس حالت میں نکلے کہ وہ کفر کی حالت میں ہوں۔‘‘

اس لیے کہ مجرم بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا کہ اسے پکڑا جائے اور سزا دے دی جائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جرم کی اس حد تک پہنچے جب اس پر گرفت جائز ہو۔ اس لیے اللہ اس کی فوراً گرفت نہیں کرتے۔

اس کے برعکس اگر آزمایشیں اور تنگیاں آ رہی ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہے۔ اس کو ایک صحیح حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

ان اللّٰہ اذا احب قوما ابتلاهم، فمن رضی فله الرضا، ومن سخط فله السخط. (سنن ابن ماجہ، رقم۴۰۳۱)

’’اللہ جن لوگوں کو پسند کرتا ہے، انھیں ابتلا میں ڈالتا ہے، سو جو اس کی ابتلا پر بھی اس سے راضی رہتا ہے تو اللہ اس کو اپنی رضوان عطا کرتا ہے، اور جو اس ابتلا پر اللہ سے ناراض ہو جائے، اللہ اس سے راضی نہیں رہتا۔‘‘

تقدیر پر ایمان

یہ بات دنیا میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ مانیں کہ اس دنیا کو چلانے والا، اس کے نظام کو چلا رہا ہے۔ نظام کو چلانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ایسے کاموں کو نہ ہونے دے جو نظام کو خراب کرتے ہیں، وہ کام ہونے دے جو اس کے نظام کو خراب نہ کرنے والے ہوں۔ اسی وجہ سے اس دنیا کی ایک تقدیر لکھی گئی ہے۔ اس کی ایک عمر ہے، اس کے اندر ہونے والے ہر کام کی ایک تعداد، مقدار اور حد ہے جو مقرر کر دی گئی ہے۔ کوئی چیز اس کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔

اس دنیا کے واقعات اور کاموں کو ان کے ان حدود میں روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے غیر محسوس عوامل (factors) اور موانع (hinderances) دنیا میں جاری کر رکھے ہیں۔ ان عوامل و موانع میں بہت سی چیزیں ہیں۔ قرآن مجید نے وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ’’یہ دن ہیں جنھیں

ہم لوگوں کے بیچ میں الٹتے رہتے ہیں۔'' (آل عمران ۳: ۱۴۰) کے اسلوب میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔ یعنی قوموں کے عروج وزوال اور فتح وناکامی اللہ تعالیٰ کے فیصلوں سے ہوتی ہے۔

ان غیر محسوس عوامل اور موانع کے پیچھے فرشتوں کا ایک پورا لشکر کارفرما رہتا ہے۔ جس کی طرف اشارہ سورۂ کہف میں موسیٰ وخضر کے قصے میں کیا گیا ہے۔ یہ ان عوامل کو خدا کے اذن ومنشا کے مطابق کنٹرول کرتے ہیں۔ قصۂ موسیٰ وخضر میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح وقت کے بادشاہ سے چند مساکین کی کشتی اللہ تعالیٰ کے اس فرشتے نے بچائی جسے ہم خضر کے نام سے جانتے ہیں:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا. (الکہف ۱۸: ۷۹)

''جہاں تک کشتی کا معاملہ ہے تو وہ مساکین کی تھی، جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے ہیں تو میں نے چاہا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں (تاکہ بادشاہ اسے پسند نہ کرے)۔ اس لیے کہ ان سے ورے ایک بادشاہ لوگوں کی کشتیاں غصب کر رہا تھا۔''

کشتی کا ٹوٹنا وہ مانع (hindrance) ہے جو بادشاہ کی پکڑ سے کشتی کو بچالے گا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ دنیا خدا کی گرفت میں ہے، جس کشتی کو بچانا اس کے پیش نظر ہوتا ہے، وہ اسے بچالیتا ہے اور جس کشتی کو نہ بچانا اس کی حکمت کے مطابق ہو، اسے نہیں بچایا جاتا۔

اس کی نہایت ہی عمدہ مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ ان کے بھائی انھیں مارنے کے لیے کنویں کی تاریکی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قافلے والے ان کی زندگی بچا کر انھیں غلام بنا کر فروخت کر دیتے ہیں۔ اور زلیخا اپنی شکست کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انھیں قید کرا دیتی ہے۔ ـــــ اور یہ تینوں یہ نہیں جانتے کہ وہ سیدنا یوسف پر یہ مشکلات جو ڈال رہے ہیں تو اس طرح وہ اصل میں کل انھیں عزیز مصر بنانے کی اسکیم کا حصہ بن رہے ہیں۔ اس قصے میں یوسف کے بھائی، زلیخا، اور جیل وہ عوامل ہیں جو سیدنا یوسف کو لکھی ہوئی تقدیر کے پورا ہونے کے لیے آگے کو دھکیل رہے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے سب کام کر رہے تھے، مگر اس کے نتائج کو اللہ تعالیٰ

کنٹرول کرر ہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ کنویں ہی میں سیدنا یوسف ڈوب جاتے، زلیخا کے قصے میں قید کے بجائے موت کی سزا سنائی جاتی، وغیرہ۔ ہم نے یہ ساری تفصیل اس لیے کی ہے تا کہ یہ سمجھ آئے کہ یہ دنیا اللہ کی مرضی پر کیسے چل رہی ہے۔ اور یہ کہ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے، وہی اس کا بنانے والا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ. (الاعراف ۷:۵۴)

''بلاشبہ تمھارا رب اللہ ہے، جس نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں بنایا، پھر یہ کہ اس کے اقتدار کو سنبھالا، وہی رات سے دن کو ڈھانپتا ہے، جو سرگرمی سے اس کے پیچھے چلتی ہے۔ سورج، چاند اور ستارے اسی کے حکم سے خدمت پر مامور ہیں، اس لیے آگاہ رہو کہ تخلیق بھی اسی نے کی اور اب (اس کی تخلیق شدہ کائنات کے اقتدار کا) معاملہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ بہت فیض رساں اور جہان والوں کا آقا و مالک ہے۔''

جب یہ حقیقت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دنیا میں اچھا برا جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خدا کے اذن سے ہو رہا ہے۔ برائی اور نیکی کو جہاں اور جب اس کا منشا ہو، وہ اسے ہونے دیتا ہے، اور جب اس کی مرضی نہ ہو، وہ اسے اپنے غیبی ہاتھوں کے زور پر روک دیتا ہے۔ اب یہ بات سوچنے کی ہے کہ جب میرے ساتھ کوئی حادثہ یا مصیبت والا معاملہ ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے منشا سے ہوا ہے۔ اس نے اس عمل کو ہونے دیا ہے۔ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی ہے۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ ہمارے ساتھ کیا ہے تو یقیناً اس کے ہونے کا فیصلہ اللہ کے علم و حکمت سے پھوٹا ہوگا جو ہر صورت میں ہمارے لیے مفید ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'لا یقضی اللہ قضاء للعبد الا کان خیرا له'' کہ اللہ بندۂ مومن

کے لیے جو بھی فیصلہ فرماتا ہے، وہ اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔'' (صحیح ابن حبان، رقم ۲۸ے۷) اب چونکہ ہمیں حادثات اور مصائب برے لگتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ بتایا ہے کہ تمھیں بری لگنے والی چیز، ہوسکتا ہے، تمھارے لیے اچھی ہو اور تمھیں اچھی لگنے والی چیز تمھارے لیے بری ہو:

وَعَسٰٓی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ وَعَسٰٓی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ. (البقرہ۲:۲۱۶)

''اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھ رہے ہو، جبکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اچھا اور پسندیدہ خیال کرو، مگر وہ تمھارے لیے بری ہو۔ (چیزوں کے اچھا برا ہونے کو) تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔''

خدا کی آغوش میں

ہم جیسے ہی یہ مان لیتے ہیں کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ چلا رہے ہیں اور اچھا برا سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ تو پھر یہ بات دوٹوک ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہونا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہونا ہے اور ہو کر رہے گا۔ اور اللہ ہمارے ساتھ جو کچھ کرے گا، وہ ہمارے لیے خیر اور بھلائی ہو گی۔ ہمارے حق میں ہونے کے فیصلے اللہ کر رہا ہے تو پھر اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ہمارے ساتھ اچھا کرے یا برا کرے، سب میں خیر ہے تو ہم اللہ کے فیصلوں کی پناہ میں ہیں۔ جس کو اس کی گود میسر ہو، وہ بھلا پریشان کیوں ہو!

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡٓ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ. لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا

''اور تمھیں کوئی مصیبت نہیں پہنچی، نہ تمھاری زمین (پیداوار میں) اور نہ تمھاری جانوں کو، مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے وجود میں لائیں۔

فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍۨ (الحدید ۵۷:۲۲-۲۳)

بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے۔ یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جا رہی ہے کہ تمھاری جو چیز ضائع ہو جائے اس پر غم نہ کرو، اور تمھیں جو نعمت ملے، اس پر مت اتراؤ، اللہ تعالیٰ نہ اکڑنے والے کو پسند کرتے ہیں، نہ اترانے والے کو۔"

یہی وجہ ہے کہ احادیث و آثار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی طرف سے اس طرح کے بہت سے بیانات ملتے ہیں کہ 'ما يصيبنا الا ما كتب لنا'، "ہم پر تو بس اتنی ہی مصیبت آئے گی جو ہمارے لیے لکھی گئی ہے۔" اس تصور سے وہ اپنی مصیبتوں پر یہ کہہ کر تسلی پاتے تھے کہ یہ تو اللہ کا لکھا ہے، اس نے تو آ کر ہی رہنا تھا۔ اور اس میں اللہ کی طرف سے بہتری ہوگی، اس کی حکمت ہوگی وغیرہ۔

چونکہ یہ دنیا اللہ کے فیصلوں سے چل رہی ہے، اس لیے یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کے فیصلے ہی ہمارے لیے نجات و تباہی کا ذریعہ ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں ایسی دعائیں بھی ہیں جن میں وہ اللہ کے کلمات یعنی فیصلوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ آپ کے الفاظ پر توجہ دیجیے۔ اس دعا کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ہر چیز جسے اللہ نے بنایا ہے، اس سے برائی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس برائی سے بچانے والی چیز اللہ کے کلمہ 'کن' جیسے فیصلے پر مبنی الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کو اس دعا میں 'کلمات اللہ التامات' کہا گیا ہے، یعنی ایسے الفاظ کہ جن میں کوئی نقص نہیں ہے، نہ فیصلے کے اعتبار سے نہ نفاذ (execution) کے اعتبار سے:

اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ. (صحیح مسلم، رقم ۲۷۰۸)

"میں اللہ کے تمام فیصلوں کی پناہ میں آتا ہوں، ان تمام چیزوں کی برائی سے جو اللہ نے تخلیق کی ہیں۔"

چیزوں کے دو پہلو

یہ کائنات چونکہ امتحان کے لیے بنی ہے، اس لیے اس میں چیزیں نعمت بھی ہیں اور امتحان بھی۔ مشکلیں مصیبت بھی ہیں اور آزمائش بھی۔ اسی لیے دونوں چیزیں یعنی نعمتیں بھی اور مصیبتیں بھی ایک حساب سے ہمارے لیے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہوتی ہیں، لیکن امتحان کے نقطۂ نگاہ سے ہمیشہ اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں کے امتحانی پرچے کے ہر سوال کی طرح خواہ وہ مشکل ہو یا آسان طالب علم کے پاس ہونے کے لیے اس کا مددگار ہے۔ ایسا ہی معاملہ ہماری دنیا کا ہے۔ یہاں کا ہر حادثہ اور ہر نعمت ایک امتحانی سوال کی طرح ہے۔ ہمارے لیے امتحان میں کامیابی کا ایک زینہ ہے۔ جس جس سوال کا ہم صحیح جواب دیتے جائیں گے، ہم کامیابی کی طرف بڑھتے جائیں گے۔ ایک ہی عمل کامیابی بھی بن سکتا ہے اور ناکامی بھی۔ وہ خوشی کا ذریعہ بھی ہے اور غمی کا بھی۔ ذیل کی آیت میں چیزوں کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

وَعَسٰۤی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ۲:۲۱۶)	''اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھ رہے ہو، جبکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اچھا اور پسندیدہ خیال کرو، مگر وہ تمھارے لیے بری ہو۔ (چیزوں کے اچھا برا ہونے کو) تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔''

ان احادیث پر ذرا تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ بات ایک اور رخ سے سامنے آئے گی:

لا یقضی اللّٰہ قضاء للعبد الا کان خیرا له. (صحیح ابن حبان، رقم ۷۲۸)	''اللہ اپنے بندے کے لیے جو بھی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔''

اور یہ حدیث بھی کہ:

عجبا لأمر المومن، ان امره کله خیر، ان اصابته سرّاء، شکر، فکان خیرا	''بندۂ مومن کا معاملہ بھی حیرت انگیز ہے اس کے لیے سب اچھا ہے۔ اگر اسے خوشی

لہ. وان اصابته ضرّاء، صبر، فکان خیرا له. (صحیح مسلم، رقم ۲۹۹۹)

لاحق ہو اور وہ شکرگزار بنے تو یہ بھی اس کے لیے اچھا ہوا۔ اور اگر اس پر مصیبت نازل ہو اور وہ اس میں صبر کرے، تو یہ بھی اس کے بھلے میں رہا۔"

مذکورہ آیت اور احادیث سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ خدا کا ہر فیصلہ دہرا اثر رکھتا ہے۔ بندۂ مومن کے لیے اس میں خیر ہی ہوتا ہے، لیکن صرف اسی صورت میں جب وہ مطلوبہ رویہ پیش کرے، جسے حدیث میں صبر اور شکر سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر وہ اس کے برعکس رویہ ظاہر کرتا ہے تو یقیناً اس کے لیے ہر فیصلے کا برا پہلو ظاہر ہو جائے گا۔

باب دوم

مشکلات اور ان کے اسباب

اب ہم ان اسباب و وجوہ کا جائزہ لیتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ ہمیں مشکلات میں مبتلا کرتے ہیں۔ مشکلات دو قسم کی ہیں: ایک انفرادی اور دوسرے اجتماعی۔ اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کی آزمائشیں کبھی ہماری کوتاہیوں اور کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہیں اور کبھی محض اللہ تعالیٰ کے پیش نظر مقاصد کی وجہ سے۔ ہم یہاں انفرادی اور اجتماعی اسباب کو الگ الگ نہیں کریں گے، مگر اللہ کے مقاصد اور ہماری طرف کے اسباب کو الگ الگ بیان کریں گے تاکہ ہم اسباب کو منفی اور مثبت پہلو سے سمجھ سکیں۔ ہماری کوتاہیوں کے بغیر محض اللہ کی طرف سے آزمائش آنا مثبت پہلو ہے اور ہماری کرتوتوں کی وجہ سے آنا منفی۔

مشکلات ہمیں پریشان کرتی ہیں، لیکن اگر ہم ان کے اسباب اور وجوہ سے واقف ہوں تو ہم ان مشکلات کی توجیہ (determination of reasons or objectives) کر کے ان کے مقابلے میں مطلوب رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے مشکلات کی آمد و شد کے ان حقیقی اسباب کا علم ایک مفید علم ہے۔ یہ علم نہ صرف ہمیں دنیا میں قلب مطمئن عطا کرتا ہے، بلکہ دلوں میں تقویٰ کی آبیاری بھی کرتا ہے۔ خدا کی اس زمین پر اس کے قانون و حکمت کے تحت جینے کے لیے یہ علم از حد ضروری ہے۔ اسی سے تقرب کی بلند منازل طے ہوتی ہیں اور اسی کے ہمراہ وہ نعمتیں ہمارے دامن میں آ گرتی ہیں کہ جنھیں ہم توشۂ آخرت بنا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے مشکلات کو ایک آیت میں یوں بیان کیا ہے:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (البقرہ۲:۱۷۷)

"اور صبر کرنے والے سختیوں اور تکلیفوں میں اور جنگ کے میدان میں، یہی اپنے ایمان میں سچے ہیں اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔"

اس آیت کی روشنی میں مشکلات سے ہماری مراد درج ذیل چیزیں ہیں:

۱۔ مالی تنگ حالی،

۲۔ جسم وجان کی تکلیف اور ضیاع،

۳۔ تذلیل ورسوائی،

۴۔ ذہنی پریشانیاں، جیسے خوف وہراس اور اضطراب وبے چینی،

۵۔ شریعت کی ذمہ داریاں،

۶۔ ایمان کے تقاضوں کی سختی، جیسے دینی وملی تقاضے، جہاد میں شمولیت، ناگہانی آفات میں قوم کی اپنی کمائی سے مدد کرنا وغیرہ۔

اسی طرح آسانی سے مراد ہے:

۱۔ مالی خوش حالی،

۲۔ جسم وجان کی راحت،

۳۔ جاہ وجلال اور عزت ونام وری،

۴۔ ذہنی آسودگی، جیسے خوف وہراس اور اضطراب وبے چینی سے آزادی،

۵۔ شریعت کی ذمہ داریوں کو آسانی سے نباہ پانا،

۶۔ ایمان کے تقاضوں کی سختی، جیسے دینی وملی تقاضے، جہاد میں شمولیت، ناگہانی آفات میں قوم کی اپنی کمائی سے مدد کرنا وغیرہ سے سرخ روئی یا نجات۔

اللہ کی طرف کے اسباب

مشکلات آنے میں اللہ تعالیٰ کے مقاصد اصلاً ہماری آزمایش پر مبنی ہیں۔ اس آزمایش کے

ساتھ کچھ دیگر مقاصد بھی ہیں، جن کے لیے اللہ تعالیٰ ہم پر مشکلات نازل کرتے ہیں۔ اگر ہم آزمایش میں ناکام ہوجائیں تو وہ فوائد بھی ہمیں پوری طرح حاصل نہیں ہوتے، جو آزمایش کے ساتھ ان مشکلات سے اللہ کے ہاں پیش نظر ہوتے ہیں۔

مثلاً، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کوئی مشکل اس لیے نازل کی ہو کہ امتحان کے ساتھ ساتھ اس میں سے گزرنے کی وجہ سے ہمارا ایمان بھی مضبوط ہو۔ چنانچہ اگر ہم صحیح رویہ اختیار کریں گے اور اس آزمایش میں کامیاب ہوجائیں گے تو یقیناً ہمارا ایمان بھی مضبوط ہوگا۔ جبکہ اگر ہم آزمایش میں ناکام ہوئے تو امتحان میں ناکامی کے ساتھ ساتھ ایمان کی مضبوطی سے بھی محروم رہیں گے۔

ناکام ہونے والے سے ہماری مراد یہ ہے کہ جیسے ہی اس پر وہ مشکل آتی ہے، وہ اس پر صبر نہیں کرتا۔ وہ یہ سوچتا ہی نہیں ہے کہ یہ آزمایش اللہ نے مجھ پر میرے امتحان کے لیے بھیجی ہے۔ چنانچہ جب وہ اسے آزمایش خیال نہیں کرتا تو اس میں غلط رویہ اختیار کر لیتا ہے، یعنی اگر صبر مطلوب تھا تو وہ صبر نہیں کرتا، اگر دعواے ایمان کی جانچ مقصود تھی تو وہ اپنے ایمان کے دعوے میں سچا ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ اس مشکل کو ایک امتحان سمجھنے کے بجائے مایوسی کا شکار ہو بیٹھتا ہے، جس سے وہ اس امتحان میں ناکام ہوجاتا ہے۔ اگر وہ اس کو اپنا امتحان سمجھتا تو پھر اس کا رویہ مختلف ہوتا، وہ صبر سے کام لیتا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ کامیاب ہوتا اور اس کا ایمان بھی اس سے مضبوطی پاتا۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر یہ آزمایش آئی کہ انھیں نمرود نے آگ میں پھنکوا دیا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام اس آزمایش کے آنے پر خدا سے مایوس ہوجاتے، اور آگ میں پڑنے سے بچنے کے لیے نمرود کی بات تسلیم کر لیتے تو خدا پر اس اعتماد، توکل اور یقین سے محروم رہ جاتے جو آگ میں پڑ کر بچ جانے پر انھیں حاصل ہوا۔ نہ وہ مقام ہی انھیں ملتا کہ جس میں اللہ رب العزت نے ان کے بارے میں وہ لازوال تبصرہ فرمایا ہے کہ ''وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ'' ''جب ابراہیم کے رب نے اسے کچھ باتوں میں آزمایا تو اس نے ان

باتوں کو پورا کر دکھایا۔'' (البقرہ ۲:۱۲۴)

اس بات کو سمجھنے کے بعد کہ آزمایش میں کامیابی کے بعد ہی مشکلات کے وہ فوائد ہمیں حاصل ہوں گے جو مشکلات میں اللہ تعالیٰ نے مضمر رکھے ہوتے ہیں، آیئے ان مقاصد واسباب پر ایک ایک کر کے نظر ڈال لیں۔

سبب 1: آزمایش

چونکہ یہ دنیا ہمارے امتحان کے لیے بنی ہے، اس لیے ہر مشکل کی بنیادی وجہ اصل میں ہماری آزمایش ہے۔ کائنات کے اس مقصد پر اس کائنات کی تخلیق اور ساخت وبناوٹ ہی گواہ ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (آل عمران ۳:۱۹۱)

''وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اور کائنات کی تخلیق میں غور کرتے ہیں، (وہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ) اے اللہ، تو نے یہ دنیا بے مقصد نہیں بنائی، (بلکہ امتحان کے لیے بنائی ہے۔ اس لیے کہ تو لغو اور بے مقصد کام کرنے سے) پاک ہے۔ (اس لیے ہمیں اس امتحان کے برے نتیجے سے بچا اور) دوزخ کی آگ سے نجات دے۔''

ہماری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس اصول پر منظم کی ہے کہ وہ ہر ہر قدم پر ہماری آزمایش کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (الملک ۶۷:۲)

''یہ وہ ذات ہے جس نے موت اور زندگی اس لیے بنائی ہے تا کہ وہ تمھیں آزمائے (اور دیکھے کہ) تم میں سے کون عمل کے اعتبار

سے اچھا ہے۔''

اس لیے یہ بات اصولی طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ موت اور زندگی کا یہ سارا نظام اصل میں ہمارے آزمانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم اسی بات کو آگے بڑھا سکتے ہیں کہ غموں اور خوشیوں اور عسر و یسر کا یہ سارا سلسلہ اصل میں ہمارے امتحان کی بساط ہے، جو ازل سے قیامت تک کے لیے بچھا دی گئی ہے۔ کسی آزمایش کا مقصد ہمیں تنگ کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمارے امتحان کے لیے آتی ہے۔

دنیا میں آنے والا ہر شخص آزمایا جائے گا۔ انبیا سے لے کر عام آدمی تک کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے، جسے آزمایش سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

آزمایش دونوں طرح سے ہوتی ہے۔ جس طرح خوشیوں سے آزمایا جاتا ہے، اسی طرح غموں اور تکلیفوں سے بھی آزمایا جاتا ہے۔ بلکہ غموں اور مشکلوں والی یہ آزمایش زیادہ عام ہے، اس لیے کہ سچے اور کھرے میں امتیاز کرنے کے لیے یہ زیادہ مؤثر ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی جب آزمایش کی بات کرتے ہیں تو تکلیفوں والی آزمایش کو زیادہ اہمیت سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً، دیکھیے صحابہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی آزمایش کو جب بیان کیا ہے تو ان میں بھی مشکلات ہی کو بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کے لیے مشکلیں ہی زیادہ بہتر امتحان ہیں:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. (البقرہ ۲:۱۵۵)

''اور ہم یقیناً تمھیں آزمائیں گے، کچھ خوف سے کچھ بھوک سے، اور کچھ مال میں کمی کر کے، کچھ جانیں چھین کر اور کچھ منفعت میں نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیجیے۔''

رسولوں کی زندگی میں مشکلات والی آزمایشیں ہمیں اسی لیے زیادہ ملتی ہیں کہ یہ منافقین اور ثابت قدموں کو ایک ہی مرحلے میں الگ الگ کر دیتی ہیں۔ اگر ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہی کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قدم قدم پر مشکلات آزمانے آتی ہیں کہ کون ہے جو

الٹے پاؤں واپس مڑ جائے گا اور کون ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا رہے گا۔

یہ مشکلات جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا جانی و مالی نقصان اور بھوک اور ننگ کی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں، اور ذہنی پریشانیاں بھی جیسے خوف و ہراس اور اضطراب و بے چینی، آیات متشابہات بھی اور سخت قسم کے حکم وغیرہ بھی۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ان مشکلات اور آزمایشوں سے اللہ کے مقرب رسول بھی گزرے ہیں۔ یہاں یہ خیال نہ کریں کہ اللہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کرتا ہے، بلکہ رسولوں اور مقربوں کی آزمایشیں بسا اوقات ہم عامیوں کے مقابلے میں کہیں سخت ہوتی ہیں:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ؟... (البقرہ ۲:۲۱۴)	''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے، اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی طرح کی مشکلیں تو پیش ہی نہیں آئیں۔ ان کو ایسی ایسی تکالیف اور سختیاں پہنچیں اور وہ ان سختیوں سے ہلا کر رکھ دیے گئے، صورت حال یہاں تک پہنچتی رہی کہ اللہ کے رسول اور ان کے ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟...''

ان آزمایشوں میں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی اس کوشش میں رہے کہ وہ اس آزمایش میں کامیاب ہو۔ ہمیں آزمایشوں میں کامیابی کے لیے جن معلومات کی ضرورت ہے، ہم انھیں ''مشکلات میں مطلوب رویے'' کے عنوان کے تحت، اس کتاب کے آخر میں، ایک مستقل باب میں عرض کریں گے۔ یہاں ہمارا مقصود صرف ان باتوں کو بیان کرنا ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی آزمایشیں آتی ہیں۔

سبب 2: تذکیر و تنبیہ

ان مشکلات کا دوسرا سبب جو آزمایشوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہوتا ہے، وہ یہ

ہے کہ یہ مشکلات اللہ تعالیٰ کی طرف سے یاد دہانی بن کر آتی ہیں:

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. (الاعراف ۷:۱۶۸)	''اور ہم نے انھیں اچھے اور برے حالات سے آزمایا تاکہ وہ واپس (صحیح راہ پر) آ جائیں۔''

یعنی ہم نے ان آزمایشوں کے ذریعے سے اپنی یاد دہانی ان کے دل میں ڈالی تاکہ وہ ہم سے روگردانی چھوڑ کر ہماری طرف واپسی کی راہ اختیار کریں۔

یہاں بھی یہ اصول یاد رکھیں کہ وہ مشکل جو آزمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے دل میں یاد دہانی ڈالنے کے لیے آتی ہے، وہ اسی صورت میں یاد دہانی کرے گی جب ہم اس آزمایش میں کامیاب ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ اصول ہم اوپر بھی بیان کر آئے ہیں کہ ہر مشکل اسی وقت اپنے تمام اثرات ہم پر ظاہر کرے گی جب ہم اس مشکل میں صحیح رویہ ظاہر کریں گے۔

واپسی کی دعوت

اوپر کی آیت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب آدمی کسی غلطی میں پڑ جائے اور ابھی اللہ کے قانون ہدایت کی وجہ سے اس کے دل پر مہر نہ لگی ہو تو مشکلات آدمی پر اس لیے بھی آتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو برے راستے سے روکنے کے لیے مشکلات میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ وہ واپس آجائیں۔

اس معاملے میں بھی عامی و عارف اور نبی و امتی سب برابر ہیں۔ قرآن مجید میں سیدنا یونس علیہ السلام کا قصہ اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے، لیکن اس میں دیکھیے کہ سیدنا یونس جیسے ہی مقررہ وقت سے پہلے اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں تو کس طرح مچھلی کا پیٹ ان کے لیے خدائی قید خانہ بن گیا اور انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے توبہ کی۔

سبب 3: توبہ و اصلاح کا موقع

اوپر ہم نے جو سبب بیان کیا ہے، مشکلات کا یہ تیسرا سبب اسی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو

آخرت میں کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے ان کے لیے یاددہانی کا اہتمام کرتے ہیں تاکہ وہ توبہ کرکے اپنے گناہوں کو دھولیں، اور وہ کل قیامت کے دن صالحین کے زمرہ میں شامل ہوں۔

سیدنا یونس کا قصہ اوپر ہم نے ذکر کیا ہے، اس میں جس طرح یاددہانی کی گئی ہے، اس سے آپ کو توبہ کا موقع نصیب ہوا، اور ان کے منہ سے توبہ کے لیے وہ لاثانی جملہ نکلا جسے قرآن کی آیت بن جانے کا شرف حاصل ہوا: 'لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'، یعنی میں اس مشکل میں تیرے الٰہ ہونے سے ہرگز انکار نہیں کرتا، الٰہ بس تو ہی ہے۔ اور تو اس سے پاک ہے کہ بلاوجہ آزمایش نازل کرے، بلاشبہ میں ہی ظالموں میں سے تھا کہ اس آفت کا مستحق ٹھہرا۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف کے بھائیوں کا قصہ بھی نقل ہوا ہے۔ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے بھائیوں کے جھوٹ اور ظلم کو ان کے بھائی ہی کے سامنے فاش کرکے ایک مشکل ان پر ڈالی تاکہ انھیں توبہ کا موقع میسر آئے اور وہ توبہ کرلیں، جیسا کہ انھوں نے اعترافِ گناہ کرکے کی۔ (سورۂ یوسف ۱۲: ۹۷)

دیکھیے، یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی عنایت ہے کہ وہ ہمیں گناہ کے بعد یاددہانی کراتا اور گناہوں کی بخشش کے لیے توبہ کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ٹھیک ایسا ہی واقعہ سیدنا آدم کا نقل ہوا ہے کہ شجر ممنوعہ کے چکھ لینے کے بعد جب زمین پر اترنے کا حکم ہوا تو اس سے انھیں تنبہ ہوا اور انھوں نے توبہ کی جسے اللہ نے قبول فرمایا:

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ. فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

(البقرہ ۲: ۳۶-۳۷)

''اور ہم نے کہا کہ اس جگہ سے نکل جاؤ، تم (آدم و ابلیس) ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ تمھارے لیے زمین میں رہنے کی جگہ ہے۔ اور وہیں پر زندگی کی ضروریات کا سامان بھی، ایک مقررہ مدت تک کے لیے موجود ہے۔ تو (اس حکم کے بعد) آدم نے اپنے رب سے توبہ کے لیے الفاظ سیکھے (اور

توبہ کی) تو اللہ نے اس پر رحم کیا، اس لیے کہ
اللہ نہایت مہربان اور توبہ قبول کرنے
والا ہے۔''

سبب 4: گناہوں کا کفارہ

مشکلات اور آزمایشوں کا چوتھا سبب جو قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کے لیے، اگر وہ ثابت قدم رہے تو ان مشکلات و مصائب کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنادیتے ہیں۔

سورۂ آل عمران (۳:۱۹۵) میں ہے کہ مسلمانوں کو ہجرت وغیرہ کی صورت میں جو اذیتیں سہنا پڑی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے ان کے گناہوں کو دھوڈالے گا۔ اور ان کو جنت میں داخل کرے گا۔

حدیث میں بھی کئی واقعات ایسے ہیں کہ جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری وغیرہ کو گناہ کا کفارہ قرار دیا ہے کہ بندۂ مومن کو ایک کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس سے اس کے گناہ جھڑتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی بعض دعائیں بھی ہم تک اس معنی کی منقول ہوئی ہیں کہ اے اللہ، میرے گناہ کو سرد وگرم حالات سے دھودے، ثلج و برد سے دھوڈال۔ یہ دعا مصائب کی طلب کی نہیں، بلکہ اس معنی کی ہے کہ جو مصائب ہم پر آتے ہیں، ان کو ہمارے لیے کفارہ بنادے۔ ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ما من مصيبة تصيب المسلم الا كفر الله بها عنه، حتى الشوكة يشاكها. (بخاری، رقم ۵۳۱۷)

''مسلمان کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، مگر یہ کہ اللہ اس کو اس کے لیے کفارہ بنادیتے ہیں، (یہ چھوٹی بڑی سب مشکلوں میں ہوتا ہے) حتیٰ کہ کانٹے کے چبھنے پر بھی۔''

سبب 5: آفتوں سے نجات

قرآن مجید میں قصہ موسیٰ وخضر میں تین میں سے دو واقعات میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مشکلات کیوں نازل کرتے ہیں۔

ایک واقعہ یوں ہے کہ خضر علیہ السلام نیک نام ماں باپ کے اکلوتے بیٹے کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ دوسرے واقعے میں وہ ایک غریب ملاح کی اس صحیح وسالم کشتی میں شگاف ڈال کر عیب دار کر دیتے ہیں، جس پر اس کے روزگار کا انحصار ہوتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ان کے یہ دونوں کام خلاف عدل اور خلاف حکمت محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے پوچھتے ہیں تو وہ حضرت موسیٰ کو بتاتے ہیں کہ جس نوجوان کو انھوں نے مار ڈالا ہے، وہ بڑا ہو کر اپنے مومن والدین کا نافرمان بننے والا تھا، اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ ان کو کفر وسرکشی میں پھنسا دے۔ اس لیے اسے ہم نے مار ڈالا ہے۔ اس کا نعم البدل ہم انھیں عطا کریں گے۔

کشتی کو انھوں نے اس لیے توڑا کہ ملک کے بادشاہ نے کسی غرض سے ملاحوں کی اچھی اچھی کشتیاں ضبط کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ انھوں نے یہ شگاف اس میں اس لیے ڈال دیا کہ بادشاہ کی ضبطی سے بچ جائے اور اس ملاح کا روزگار چلتا رہے:

اَمَّا السَّفِيۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ فِى الۡبَحۡرِ فَاَرَدْتُّ اَنۡ اَعِيۡبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمۡ مَّلِكٌ يَّاۡخُذُ كُلَّ سَفِيۡنَةٍ غَصۡبًا. وَاَمَّا الۡغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤۡمِنَيۡنِ فَخَشِيۡنَاۤ اَنۡ يُّرۡهِقَهُمَا طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا. فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيۡرًا مِّنۡهُ زَكٰوةً وَّاَقۡرَبَ رُحۡمًا. (الکہف ۱۸:۷۹-۸۱)

”جہاں تک کشتی کا معاملہ ہے تو وہ مساکین کی تھی، اور اس پر وہ دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ میں اس کو عیب دار کر دوں، کیونکہ ان کے اس طرف ایک بادشاہ لوگوں کی (ہر بے عیب) کشتی کو زبردستی چھین رہا تھا۔ رہا وہ لڑکا جسے ہم نے مار ڈالا تو اس کے والدین مومن تھے، اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ لڑکا ان کو کفر وسرکشی میں نہ پھنسا دے۔ تو ہم نے چاہا کہ ان کا

پروردگار انھیں نیکی اور محبت میں اس سے
بڑھ کر بیٹا عطا کرے۔''

یعنی اولاد کے چھن جانے کا غم بوڑھے والدین کے لیے اس کفر و سرکشی سے یقیناً کم تھا جس میں وہ بیٹے کی وجہ سے پھنسنے والے تھے۔ اسی طرح کشتی کے شگاف کی پریشانی اس تکلیف کے مقابلے میں بہت کم تھی، جو اس کے چھن جانے کے بعد بے روزگاری کی صورت میں ان مسکینوں کو جھیلنی پڑتی۔

اس سے ہم اپنی مشکلات کے بارے میں سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس مشکل میں مبتلا کیا ہے، وہ دراصل ہمارے لیے کسی بڑی آفت سے نجات کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمیں یہ نعمتیں حاصل نہیں ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ ان کا نہ ہونا ہی ہمارے لیے مفید ہوگا، اس لیے کہ ان کے ہونے سے ہم کسی بڑی آفت کا شکار ہو سکتے ہیں۔

مثلاً، ایک آدمی اس دکھ میں مبتلا رہتا ہے کہ میرے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے، کھانے کو کھلا رزق نہیں ہے۔ پہننے کو عمدہ کپڑے نہیں ہیں۔ عیش و عشرت کے لیے پیسے نہیں ہیں تو وہ اپنے مالک و آقا سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اس سے شکوہ کرتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر آستانوں پر جاتا ہے۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے کہ اللہ علیم و خبیر اور عزیز و حکیم نے مجھے ان نعمتوں سے محروم رکھا ہے تو اس کی وجہ میری بھلائی کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔

واقعۂ موسیٰ و خضر علیہما السلام سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ ہمیں اس لیے ایک مشکل میں ڈال دیتا ہے کہ اس کی وجہ سے ہم ایک بڑے حادثے سے بچ جاتے ہیں۔

میں اپنے طلبہ کو اکثر یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ کبھی یہ ہوتا ہے کہ تم موٹر سائیکل یا گاڑی پر کہیں تیزی میں جانا چاہتے ہو، گھر سے اس خیال سے نکلتے ہو کہ بس ایک آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا، لیکن گھر سے نکلتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی پنکچر ہو گئی ہے۔ اس موقع پر تم بڑی تکلیف محسوس کرتے ہو اور اگر غصہ آ جائے تو کبھی اپنی گاڑی کو موٹی سی گالی بھی دے دیتے ہو، لیکن تم یہ نہیں

سوچتے کہ شاید اللہ نے تمھیں کسی حادثے سے بچایا ہو۔ ہوسکتا تھا کہ اگر تم اسی تیزی سے چلتے رہتے تو اگلے چوراہے میں تیزی سے آنے والی کوئی گاڑی تمھیں کچل کے رکھ دیتی یا تم یہ نہیں سوچتے کہ جس کام کے لیے تم جا رہے تھے، وہ اس پنکچر کی وجہ سے ہونے سے رہ گیا ہے تو یقیناً اس وقت اس کا ہونا اللہ کی نگاہ میں تمھارے لیے نقصان دہ تھا۔

سبب 6: دوسروں کے کسی اہم امر کی حفاظت

ان مشکلات میں ڈال کر اللہ تعالیٰ بعض اوقات ہم سے ایسے کام کرا رہے ہوتے ہیں جن میں ہماری آزمایش اور فائدوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے کچھ اہم امور سرانجام دیے جا رہے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے، ہماری ایک مشکل کسی دوسرے کے لیے سامان فتح بن جائے۔ ہماری تنگی کسی کے لیے فاقہ سے نجات بن رہی ہو۔ اور ہمارا فاقہ کسی کے لیے زندگی بھر کے سرمایے کی نوید بن کر آ رہا ہو۔ یہ بات بھی موسیٰ و خضر علیہما السلام کے قصے سے کھلتی ہے۔ سیدنا موسیٰ اور خضر اسی سفر میں ایک بستی میں سے گزرتے ہیں، وہاں وہ ان سے کھانا طلب کرتے ہیں، مگر کھانا نہیں ملتا، پھر دیکھتے ہیں کہ ایک دیوار گرنے والی ہے، حضرت خضر وہ دیوار مرمت کر دیتے ہیں اور اسے اپنی بنیاد پر سیدھا کھڑا کر دیتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ کے پوچھنے پر حضرت خضر یہ بتاتے ہیں کہ:

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا. (الکہف ۸۲:۱۸)

''وہ جو دیوار تھی تو اس کی حقیقت یہ تھی کہ وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی، جو اسی شہر میں مقیم تھے۔ اس دیوار کی بنیاد میں ان کا خزانہ دبا تھا، ان کا باپ بہت نیک آدمی تھا، تیرے رب کا ارادہ یہ تھا کہ وہ بڑے ہو کر اس خزانے کو خود ہی نکالیں، یہ تیرے رب کی رحمت کی غرض سے ہوا۔ یہ سب کام میں نے خود سے نہیں کیے، بلکہ خدا کے حکم ہی

سے کیے۔ یہ ہے میرے سب کاموں کی
حقیقت جن پر تو صبر نہیں کر سکا تھا۔“

سبب 7: ترقی اور بڑھوتری

مشکلات کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی مشکلات میں اس لیے بھی ڈالتے ہیں کہ وہ دنیا میں ان کے حالات درست کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انھیں ترقی دے کر گدا سے اٹھا کر شاہ بنانا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی غربت کو امارت میں بدلنے کے لیے انھیں ایک مشکل یا ایک طویل سلسلۂ مشکلات کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مثلاً، اسے شہرت دینے کے لیے کسی مشکل کا شکار کر دیں گے۔

اس کی نہایت ہی عمدہ مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ ان کے بھائی انھیں مارنے کے لیے کنویں کی تاریکی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قافلے والے ان کی زندگی بچا کر انھیں غلام بنا کر فروخت کر دیتے ہیں۔ اور زلیخا اپنی شکست کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انھیں قید کرا دیتی ہے۔ — اور یہ تینوں یہ نہیں جانتے کہ وہ سیدنا یوسف پر یہ مشکلات جو ڈال رہے ہیں تو اس طرح وہ اصل میں کل انھیں عزیزِ مصر بنانے کی اسکیم کا حصہ بن رہے ہیں۔

ٹھیک ایسی ہی داستان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی ہمیں ملتی ہے کہ ان کے بھائیوں (قریش) نے انھیں اپنے گھر سے نکالا، اور آپ اپنے مصر (مدینہ) میں آ کر فاتح مکہ اور عربوں کے حاکم و آقا بنے۔

اسی بات کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی تسلی کے لیے انشراح صدر اور آپ کی شہرت کو سامنے لا کر یہ فرمایا کہ فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ‘، (الم نشرح ۹۴:۵) یعنی تم پر جو یہ مشکلات آئی ہیں تو اپنے جلو میں آسانیاں اور نعمتیں لے کر آئی ہیں اور کچھ آسانیاں تمھاری منتظر ہیں۔ تنگی اس لیے آتی ہے کہ تمھاری ترقی کا سبب بنے۔ اور یہ تنگیاں دراصل جلبِ نعمت کا سبب ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جو فرمایا گیا کہ وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ‘، (الم نشرح ۹۴:۴) یعنی کیا ہم

نے تمھارا بول بالا نہیں کیا؟ (یعنی تمھاری بات عربوں میں نہیں پھیلی؟)۔ ایک طرف یہ جملہ اللہ کی عنایت کی طرف توجہ مبذول کرا رہا ہے کہ اب جن مشکلات میں سے آپ گزر رہے ہیں تو ان میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جس اللہ نے یہ مشکلات پیدا کی ہیں، وہ وہی ہے جس نے پہلے آپ پر عنایات بھی کیں ہیں، تو وہ ان دنوں کی طرح اس مشکل کے بعد بھی آسانی لے آئے گا۔

دوسری طرف یہ کلام یہ بھی بتا رہا ہے کہ پچھلے دس بارہ برسوں میں جن مشکلات سے آپ گزرے ہیں، انھی کے طفیل یہ چیزیں بھی آپ کو حاصل ہوئی ہیں کہ آپ کو انشراح صدر (یعنی دین پر اطمینان اور ذہنی سکون) ہوا ہے، آپ کا بول بالا ہوا ہے (شہرت ہوئی ہے)، آپ کی ذمہ داری کا بوجھ ہلکا ہوا ہے، اس لیے کہ مشکل کے ساتھ آسانی لگی ہوئی ہے۔ آپ کو جو شہرت حاصل ہوئی، قرآن نے اسے رفع ذکر کہا ہے۔

یہ رفع ذکر آپ کو ان مشکلات میں سے گزرے بغیر حاصل نہ ہوتا، اس لیے کہ مشکلات میں آپ کی بلند کرداری روز بروز نمایاں ہوتی گئی۔ آپ کی ذات والا صفات کی سچائی ہر گھڑی پوری قوت سے سامنے آنے لگی، اور وہ لوگ جو آپ کو نہیں جانتے تھے، ان کے لیے وہ ایک روشن دلیل بننے لگی۔

ہرقل اور ابوسفیان کی گفتگو کو یاد کیجیے کہ اس موقع پر اگر ابوسفیان ہرقل کو یہ خبر دیتے کہ ـــــ نعوذ باللہ ـــــ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ جنگ جیتنے کے لیے دغا اور فریب سے کام لے لیتے ہیں تو ہرقل یہ نہ کہہ سکتا کہ بلاشبہ آپ سچے نبی ہیں۔ رفع ذکر یہی ہے کہ عرب اور عرب سے باہر بھی آپ کو نیک نامی مل چکی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس پہلو سے ہمارے لیے بھی یہ اصول سامنے آتا ہے کہ مشکلات اور آسانیاں ہماری زندگی میں اس لیے بھی آتی ہیں کہ ہمیں آگے بڑھائیں، ہمارے لیے ترقی کا زینہ بنیں اور قدم قدم ہمیں آگے بڑھاتی رہیں۔

سبب 8: تزکیۂ قلوب

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے انھیں مشکلات میں ڈالتے ہیں تاکہ ان کے سینوں کا میل دھل جائے اور ان کے نفوس ان کمزوریوں سے پاک صاف ہو جائیں۔ سورۂ آل عمران میں اسی حقیقت کو احد کی شکست کی مشکل کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ 'وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ'، ''تاکہ اللہ جو کچھ تمھارے دلوں میں کجی ہے، اسے صاف کر دے۔'' (۳:۱۵۴)

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایتوں میں سے ایک عنایت ہے کہ وہ ہمیں ایسی مشکلات میں ڈالتا ہے کہ ہمارے سینے خامیوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مرحوم اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

''عذاب کا مقصد کفار کو مٹانا ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہل ایمان کو عقلی و اخلاقی کمزوریوں سے پاک کرنا۔ ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ قانون الٰہی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا چاہتا ہے، اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے، بلکہ مختلف آزمایشوں اور امتحانوں کے ذریعہ سے اس کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دور فرماتا رہتا ہے۔ ہلاکت کے حوالہ وہ کسی قوم کو اسی وقت کرتا ہے جب وہ زندگی کے اصلی اوصاف سے بالکل خالی ہو جاتی ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/۱۹۴)

سبب 9: حق اور ذات الٰہی پر اطمینان

سورۂ الم نشرح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو مشکلات آئیں، ان سے جو مقاصد اللہ تعالیٰ نے حاصل کیے، ان میں سے ایک ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: 'اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ'، ''کیا ہم نے حق کے لیے تمھارا سینہ نہیں کھولا۔'' (الم نشرح ۹۴:۱)

حق پر یہ اطمینان جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا، ان مشکلات کے بغیر ناممکن تھا، جن

کا پچھلے دس بارہ برسوں میں آپ نے ہلا دینے والے روز وشب میں سامنا کیا تھا۔ نمرود کی آگ میں جھونکے جانے سے پہلے خدا کی نصرت پر یقین ویسا کبھی نہیں ہوسکتا جو اس میں جھونکے جانے کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو ملا ہوگا۔

ٹھیک اسی اصول پر اللہ اپنے عام بندوں پر مشکلات نازل کرتا، انھیں اپنی طرف راغب کرتا اور حق کے حق ہونے پر ان کے دلوں کو اطمینان سے بھر دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں آیا ہے کہ جب ان پر کوئی مشکل بات اترتی ہے تو ان کے ایمان اور بڑھ جاتے ہیں۔

سورۂ فتح (۴۸:۴-۷) میں اللہ تعالیٰ نے آزمایشوں خواہ وہ مشکلات کی صورت میں ہوں یا آسانیوں کی صورت میں ان کی وجہ یہی بتائی ہے کہ اللہ اہل ایمان کے ایمان کو بڑھائے اور ان کا اس بات پر پورا یقین ہو جائے کہ کائنات اللہ ہی کے کنٹرول میں ہے، سارے کے سارے لشکر اس کے ہیں:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا. (۴۸:۴)

”وہ ذات ایسی ہے کہ (مشکل مواقع پر) مومنین کے دل میں سکون نازل کرتی ہے تاکہ ان کے ایمان پر مزید ایمان بڑھ جائے۔ اور انھیں اس بات پر اطمینان ہو کہ زمین وآسمان کے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور وہ علم وحکمت والا ہے۔“

سبب 10: تربیت (اعلیٰ صلاحیتوں اور حوصلوں کی نشو ونما)

انسان تجربات اور حوادث سے سیکھتا ہے۔ ایک صحیح مزاج والے آدمی کے اندر حوادث ایسے داعیات اور جذبات پیدا کر دیتے ہیں کہ آدمی ایک پہاڑ کی طرح مضبوط بن کر ابھرتا اور وہ اپنی مشکلات پر دکھی اور رنجیدہ ہونے کے بجائے ایک حوصلہ مند آدمی کی طرح ابھر کر سامنے آتا ہے۔

سورۂ آل عمران میں اسی اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ:

فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (۱۵۳:۳)

''تمھیں غم پر غم لاحق ہوا تاکہ تم نقصان پر غم زدہ نہ ہوا کرو اور نہ کسی مصیبت پر دل گرفتہ ہوا کرو اور جو تم عمل کرتے ہو، اسے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔''

سورۂ حدید میں یہی اصول اللہ تعالیٰ نے مزید کھول کر بیان کیا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ. لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. (۲۳-۲۲:۵۷)

''تمھیں کوئی مصیبت ایسی نہیں پہنچتی، نہ زمین کی نہ تمھاری جانوں کی، مگر وہ وجود میں آنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان بات ہے۔ یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جا رہی ہے کہ تمھاری جو چیز جاتی رہے، اس پر غم نہ کرو اور نہ اس چیز پر اتراؤ جو اس نے تمھیں بخشی ہے۔ اور یاد رکھو اللہ اکڑنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

''اس موقع پر تمھیں اس حقیقت کی یاددہانی اس لیے کرائی جا رہی ہے کہ نہ تم کسی چیز کے فوت (ضائع) ہونے پر غم کرو اور نہ کسی چیز پر جو تمھیں ملے اتراؤ اور فخر کرو، بلکہ اس عقیدے (ایمان بالقدر) کی روشنی میں تمھارا کردار یہ ہونا چاہیے کہ تمھیں کوئی مالی یا جانی نقصان پہنچے تو اس پر صبر کرو کہ یہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق پہنچا ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اگر کوئی نفع پہنچے تو اس پر اپنے رب کے شکرگزار بنو کہ اسی نے تمھیں اپنے فضل سے نوازا ہے۔ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اترانے نہ لگو کہ یہ تمھاری تدبیر و قابلیت کا ثمرہ اور تمھارے استحقاق کا

کرشمہ ہے۔" (تدبر قرآن ۸/۲۲۴)

مشکلات میں مضمر یہ مقصد پوری کائنات میں جاری وساری ہے۔ آدمی اگر تلمذ کی "ذلت" برداشت نہ کرے تو وہ صاحب علم نہیں بن سکتا۔ بچہ اگر گرنے کی صعوبت نہ اٹھائے تو چل نہیں سکتا۔ آدمی اگر چھوٹی مشکلات پر صبر نہ کرے تو بڑی مشکلات کے مقابلے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ آدمی اگر مصائب کا سامنا نہ کرے تو وہ اس دانش اور حلاوت سے محروم رہتا ہے جو مصایب سے گزرنے والے پالیتے ہیں۔

بچوں کو بالعموم دیکھا گیا ہے کہ وہ بیماری کے بعد سیانے ہوجاتے ہیں۔ طالبِ علم مشکل قسم کے کورسز کے بعد زیادہ صاحب علم ہوجاتے ہیں۔ آسانیاں تلاش کرنے والے طالب علم ہمیشہ نالائق رہتے ہیں۔ اس کتاب کے پہلے باب میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ مشکلات کا یہ فیض صرف اسی کو حاصل ہوتا ہے جو ان مشکلات کے آنے پر صحیح طرز عمل اختیار کرے گا۔ اور ان کو ایک امتحان سمجھتے ہوئے ان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس طرز عمل کا نام صبر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ 'وَجَدْنَا خَیرَ عَیشِنَا بِالصَّبْرِ'، "ہم نے اپنی زندگیوں کی بڑھیا چیزیں مشکلات میں صبر کرکے ہی پائیں۔" (بخاری)

سبب 11: دلوں کی کھوٹ کو پرکھنا

سورۂ آل عمران میں احد کی ناکامی اور اصحاب رسول کی شہادت کو اللہ تعالیٰ نے دلوں کی کھوٹ کو پرکھنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ لِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ. وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. (۳:۱۵۴)

"یہ اس لیے ہوا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اللہ اسے پرکھے۔ اور جو خرابی تمھارے دلوں میں ہے اللہ اسے صاف کردے۔ اور اللہ دل کے داخلی امور سے بھی خوب واقف ہے۔"

مراد یہ ہے کہ دلوں کی کھوٹ کو پرکھنے کے لیے بھی اللہ ہمیں امتحان میں ڈالتا ہے۔ اس عمل سے ایک طرف تو ہمارا امتحان ہو رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف ہمارا ضمیر اور ہمارے اردگرد کا ماحول ایسے مواقع پر ہماری غلطیوں کی نشاندہی (point out) کرتا ہے۔ اس سے ہمارے لیے یہ راستہ کھلتا ہے کہ ہم آزمایش کے دنوں میں اپنی خامیوں سے واقف ہو کر ان کے دور کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ جو لوگ ہمیں بتائیں، اس پر بھی دھیان دیں اور جس خرابی سے ہمارا دل ہمیں آگاہ کرے، اس کی اصلاح کے لیے بھی آمادہ ہو جائیں۔

سبب 12: درجات کی بلندی

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مشکلات اتار کر ان کے درجات بلند کرتا ہے۔ اللہ ان مشکلات میں اپنے بندوں کو ڈال کر ان کو جنتی بناتا ہے۔ اور وہ جس جذبۂ ایمانی سے اپنے رب کی کسی آزمایش سے کامیاب نکلے گا اللہ اس کے اتنے ہی درجات بلند کریں گے۔

اوپر ہم پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں لوگوں کی ترقی کے لیے انھیں مشکلات میں ڈالتا ہے۔ یہاں یہ جان لیجیے کہ اللہ ان آزمایشوں کو اس لیے بھیجتا ہے تاکہ وہ اپنے درجات کی بلندی کا سامان کر سکیں۔ —— چنانچہ دنیا میں مشکلات کی گھاٹی چڑھ کر ایک آدمی جنت کے چھوٹے درجے سے بڑے درجوں کی طرف چڑھ سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جو آزمایش ہمارے سر پر آئی ہے، وہ اصل میں ہماری کامیابی اور خدا کے قریب سے قریب تر جانے کا زینہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

ان عِظم الجزاء مع عِظم البلاء. ’’بلاشبہ بڑا انعام بڑی آزمایش ہی پر ملے گا۔‘‘ (ترمذی، رقم ۲۳۹۶)

ہم نے مشکلات کی اقسام بتاتے وقت یہ عرض کیا تھا کہ اللہ کے سخت احکام اور بڑی بڑی ذمہ داریاں بھی دراصل ایسی ہی مشکلات ہیں۔ غزوۂ بدر کی مشکل سب شرکاے جنگ کے لیے جنتی ہونے کا مژدہ لے کر آئی۔ اور شہداے جنگ کی زندگی کا سبب بن گئی۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی بعثت بھی ان کی قوم کے لیے ایک بڑی مشکل آزمائش تھی، جس میں سے جو جس قدر کامیابی سے گزرا، وہ اسی قدر درجہ پا گیا۔

سبب 13: عبرت اور اسوہ

قرآن مجید میں یہ بات بھی متعدد جگہ پر آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بعض اوقات اس لیے بھی مشکلات نازل کرتے ہیں کہ انھیں بالترتیب اسوہ، موعظت اور عبرت بنا دیں۔ مثلاً معذور لوگ ہماری عبرت و موعظت کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔

اللہ انبیا و صالحین پر مشکلات کے پہاڑ توڑ کر ان کی سیرتوں کو آنے والوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنا دیتے ہیں۔ قریش کی بدتمیزیاں، شعب ابی طالب کی قید اور بھوک، طائف کی وادی کی سنگ باری، احد کے زخم اور اس میں ایک گونہ شکست، اور ان سب مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثال کردار ہمارے لیے اسوہ بنا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری، سیدنا ابراہیم کا اسماعیل کو مکہ میں چھوڑنا، سیدنا یوسف کا قید ہونا اور رہائی کے وقت کی استقامت سب اسی اسوۂ حسنہ کی بے مثال داستانیں ہیں۔

معذور لوگوں کی مشکلات ہمارے لیے موعظت ہیں۔ اللہ کسی کو پیدائشی اندھا بنا دیتا ہے۔ کسی کو پاگل، کسی کو لنگڑا اور کسی کو اپاہج، یہ سب ہمارے لیے نصیحت کی چیزیں ہیں۔ اللہ ہمیں بھی ایسا بنا سکتا ہے۔

برے لوگوں پر جو سزائیں نازل ہوتی ہیں، خواہ وہ اجتماعی صورت میں ہوں یا انفرادی صورت میں، ان کو عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ قرآن ان عذابوں کو 'نکال' یعنی عبرت کہتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو بندر بنا کر انھیں بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت بنایا:

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ. فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ.	''ہم نے ان سے کہا کہ نامراد بندر بن جاؤ، تو یوں ہم نے ان کو عبرت بنا دیا، اس وقت کے اور بعد کے لوگوں کے لیے۔ اور متقی

(البقرہ۲:۶۵-۶۶) لوگوں کے لیے اس میں سامان نصیحت۔''

سبب 14: دینونت کا نشان

دینونت کے معنی ہیں کسی قوم کی طرف رسول بھیج کر اس کے بارے میں فیصلہ کر دینا۔ اور یوں اسے ایک نشانی بنا دینا کہ اللہ ہے اور اس کے یہ رسول سچے ہیں۔ مزید یہ کہ ان پر ایمان لانے والے ہی نجات پائیں گے اور ان کا انکار کرنے والے عذاب میں پڑیں گے۔ اس مقصد کے لیے انبیا میں سے بعض لوگوں کو رسول بنایا گیا تا کہ ان کے ذریعے سے دینونت کی جائے۔ اسی مقصد کے لیے قدیم اقوام کے لیے بار بار قرآن مجید میں آیا ہے کہ:

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ. هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ. (آل عمران۳:۱۳۷-۱۳۸)

''تم سے پہلے بھی قوموں میں رسولوں والی یہ سنت پوری ہوئی ہے تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا، یہ لوگوں کے لیے کھلی بات اور ہدایت ہے اور متقین کے لیے نصیحت۔''

اسی سنت اور اصول پر فرعون کو اللہ نے رہتی دنیا کے لیے اپنے ہونے کی نشانی بنایا ہے:

فَالۡيَوۡمَ نُنَجِّيۡكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ. (یونس۱۰:۹۲)

''تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا میں سے) بچا لیں گے تا کہ تو بعد والوں کے لیے (ہماری طرف سے) ایک نشانی بنے، بے شک بہت سے لوگ ہماری ایسی نشانیوں سے غافل ہیں۔''

بعثت عیسوی کے بعد یہود کو قوموں کے لیے عبرت بنایا کہ وہ کس طرح بار بار ابھریں گے اور بار بار پیٹے جائیں گے:

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡا

''یہ (یہود) جہاں کہیں بھی رہیں، ان پر

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. (آل عمران ۳:۱۱۲)

ذلت تھوپ دی گئی، سوائے ان مواقع کے جب اللہ کے کسی عہد کے تحت انھیں سہارا مل جائے یا لوگوں سے کسی عہد معاہدے سے انھیں کوئی سہارا حاصل ہو اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے۔ ان پر مسکنت (پستی) مسلّط کر دی گئی۔ یہ اس لیے کہ یہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، نبیوں کو بلا وجہ قتل کرتے رہے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ انھوں نے ہماری معصیت اختیار کی اور حدود سے تجاوز کیا۔"

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے ساتھ یہ صورت حال ہوئی کہ انھیں ہمیشہ کے لیے حضرت عیسیٰ کے پیرو کاروں کے آگے کمزور کر دیا گیا:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (آل عمران ۳:۵۵)

"اور (اے عیسیٰ) تیرے پیرو کاروں کو قیامت تک کے لیے تیرا انکار کرنے والوں پر غالب کر دوں گا۔"

یوں قوموں کے عذابوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالت اور آخرت کے حق میں بطور ایک حسی دلیل کے پیش کیا ہے کہ قوموں کا رسولوں کے آنے کے بعد عذاب اس بات کا پتا دیتا ہے کہ کل قیامت برپا ہوگی اور خیر وشر کا اسی طرح فیصلہ کیا جائے گا، جس طرح رسولوں کے دور میں ان قوموں کے بارے میں کیا گیا۔

سبب 15: اللہ تعالیٰ کا تکوینی انتخاب

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہماری زندگی کا ایک اصول بیان کیا ہے کہ ہم نے تمھارے

درمیان دنیا کی چیزوں کو برابر نہیں بانٹا، بلکہ کسی کو کم دی ہیں، کسی کو زیادہ اور کسی کو ان سے محروم رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا سبب یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر ہم سب کو برابر چیزیں عطا کر دیتے تو دنیا میں ہم ایک دوسرے سے کام نہ کرا سکتے۔ کوئی موچی، جولاہا یا کسان بننے کو تیار نہ ہوتا۔ ہر شخص بیٹھ کر کھانے کی سوچتا اور یہ کوئی بھی نہ چاہتا کہ بھاری اور مشکل کام کرے۔

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انتخاب کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا انتخاب غربت کے لیے اور بعض کا امارت کے لیے، بعض کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کا اور بعض کے لیے کم تر صلاحیتوں کا، بعض کے لیے عزت و شرف کا، بعض کے لیے رسوائی اور کمی کمین ہونے کا۔ اور پھر ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں بھی بے شمار درجے ہیں، جن کی وجہ سے معاشرے میں ان کے درجات مختلف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پھر مختلف درجے کے کام ان سے لینے ممکن ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ محض آزمائش کے لیے ہے۔ نہ جس کو عزت ملی ہے، وہ کوئی حقیقی عزت ہے اور نہ جس کو ذلت ملی ہے، اس کی ذلت کوئی حقیقی ذلت ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کو ان کے پروردگار نے ان کے امتحان کے لیے دیا ہے۔ اس امتحان کے لیے جب وہ غربت کا کسی کے لیے فیصلہ کرتا ہے تو اپنے علم و حکمت کے تحت لوگوں کو خود چنتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے کہ یہ کیا مبارک پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسکیم میں مجھے بھی چنا ہے۔ اگر میں متوسط آمدنی والا ہوں تو اس وقت خدا نے مجھے اسی لیے چنا ہے اور اگر میں غریب ہوں تو اس وقت اسی مقصد کے لیے اس نے میرا انتخاب کر کے اپنی مخلوقات کے لیے مسخر کر لیا ہے۔

یہ میرے بارے میں اللہ کا فیصلہ ہے کہ اس نے مجھے اس طبقے کے لیے چنا ہے۔ مجھے اللہ کے فیصلے پر شاکی ہونے کے بجائے اطمینان قلب کے ساتھ محنت کر کے زندگی گزارنی چاہیے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جن کو دولت ملی ہے، وہ کوئی انعام یافتہ نہیں وہ بھی آزمائش میں سے گزر رہے ہیں۔ مال داروں کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انھیں یہ مال امتحان کے لیے ملا ہے اور ان کے مالوں میں غریبوں کا بھی حصہ ہے۔ یہاں یہ بات بھی موجب تسلی ہو سکتی ہے کہ یہ ناممکن نہیں ہے کہ ایک

آدمی ایک طبقے سے نکل کر دوسرے طبقے میں چلا جائے، اس لیے کہ کسی وقت میں ایک شخص کی ضرورت ایک طبقے اور اسی کی کسی وقت دوسرے طبقے میں ہو سکتی ہے۔

بہرحال آدمی جس طبقے میں بھی ہو، اسے 'رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا' کے مقام پر رہنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس وقت کے حالات خواہ اچھے ہوں یا برے وہ اللہ کے فیصلے کی بنا پر ہیں، جس فیصلے میں میرے بارے میں موجودہ صورت حال میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

سبب 16: خبیث وطیب میں امتیاز

رسولوں کے زمانے میں بالخصوص، یہ سبب بہت زیادہ روبہ عمل ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں جو لوگ دنیوی مقاصد سے شریک ہو جاتے ہیں، جماعت صحابہ کو ان سے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ آزمائشیں بھیجتے ہیں تاکہ صحابہ اور مخلص مسلمان چھانٹ کر الگ کر لیے جائیں اور منافقین الگ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے غزوات کو بھی آزمائش کے طور پر استعمال کیا۔ اور ہر جنگ کے موقع پر منافقین اپنے آپ کو نمایاں کرنے پر نادانستہ طور پر مجبور ہوتے رہے۔ رسولوں کے بعد بھی اجتماعی کام کرنے والے اس تجربے سے گزرتے ہیں، لیکن اس کی شدت اتنی نہیں ہوتی اور نہ کیفیت اتنی واضح ہوتی ہے کہ اسے منافقت کہا جا سکے۔

عام زندگی میں یہ اصول بہرحال چلتا رہتا ہے، اس لیے کہ اس دنیا ہی کی آزمائش سے جنتی اور دوزخیوں کو چنا جاتا ہے۔

ہماری طرف کے اسباب

پچھلی فصل میں ہم نے ان اسباب کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ ان اسباب کی نوعیت مشکلات کے مقاصد کی سی ہے، یعنی پچھلے باب میں مشکلات کے آنے کے مقاصد زیر بحث تھے۔ اب اس فصل میں ہم ان اسباب کا ذکر کریں گے، جن کی وجہ منفی ہے۔ یعنی وہ

اسباب یہاں زیر بحث آئیں گی جن میں ہماری کوتاہیاں، غلطیاں اور نقائص شامل ہیں۔

سبب 17: غلطی اور گناہ

بندۂ مومن اگر گناہ کرے مثلاً جھوٹ بولے یا دھوکا دے تو اللہ تعالیٰ اس کی گرفت کرتے ہیں، اس گرفت کے مقاصد ہم اوپر پڑھ چکے ہیں: کبھی ہمیں بیدار کرنا، کبھی توبہ کرنے کی توفیق دینا اور کبھی ہمارے گناہوں کا کفارہ بنانا، وغیرہ، لیکن ان کی اصل سزا قیامت کے دن ملے گی، اگر وہ گناہ توبہ یا اللہ کی کسی آزمائش کی وجہ سے جھڑ جائے تو پھر قیامت کے دن آدمی اس کی سزا سے بچا رہے گا۔ البتہ چونکہ اس دنیا میں بھی گناہوں کی وجہ سے مصائب آتے ہیں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی مثال سے سمجھ لیا جائے۔

مثلاً جھوٹ کو لیجیے اگر آدمی کاروبار کی بنیاد جھوٹ پر رکھ دے تو جلد یا بدیر اس کا جھوٹ اس کے کاروبار کے لیے نقصان کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس کے گاہکوں کا اعتماد اس پر سے اٹھ جائے گا۔ چنانچہ کاروبار کے مندے کی صورت میں اس پر ایک افتاد آ سکتی ہے۔

البتہ غلطی کا معاملہ الگ ہے۔ غلطی سے ہماری مراد دنیوی امر کو سرانجام دینے میں خامی چھوڑ جانا ہے۔ مثلاً، معاملہ کو سمجھے بغیر اقدام کر دینا، تدبیر کا صحیح نہ ہونا، انسانی معاملات میں بے حکمتی، مطلوبہ محنت نہ کرنا، نرمی یا سختی میں غلو، معاملات میں عدم توازن، سنجیدہ امور میں لاپروائی اور ٹال مٹول، لین دین میں بددیانتی، وقت کی پابندی اور عہد کی پاسداری نہ کرنا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے دینی اور اخلاقی جرائم کی سزا اصلاً آخرت میں رکھی ہے اور دنیوی امور میں تدبیر کی غلطی یا محنت میں کمی کی سزا اس دنیا میں۔ دنیوی امور میں مادی اصولوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اصول بھی چلتے ہیں، جن کا اثر دنیوی امور پر جو پڑتا ہے، سو پڑتا ہے، مگر آخرت میں ان کی وجہ سے پکڑ ہوگی۔

مادی اور اخلاقی اصولوں کے فرق کو بھی سمجھ لینا چاہیے تاکہ ہماری باقی گفتگو کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اخلاقی اصولوں سے مراد دیانت داری، خوش اخلاقی جیسے امور ہیں اور مادی اصولوں سے مراد

اچھی طرح سوچنا، عمدہ تدبیر کرنا، کاموں کی شرائط پوری کرنا وغیرہ۔

اب ہم ایک مثال سے سمجھتے ہیں کہ جس سے مادی واخلاقی اصولوں کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی اور یہ بھی سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کس چیز کا بدلہ اسی دنیا میں ہے اور کس چیز کا آخرت میں۔

فرض کریں کہ آپ کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو دونوں پہلوؤں سے معاملات کرنا پڑیں گے۔ مثلاً اگر آپ دیانت داری سے معاملہ کریں، تول پورا تولیں تو ان کا بھی ایک مثبت اثر کاروبار پر پڑے گا اور اگر آپ دیانت داری نہیں کریں گے، ناپ اور تول میں کمی کریں گے تو اس کے بھی منفی اثرات کاروبار پر پڑیں گے، لیکن ان کی معصیت اتنی زیادہ ہے کہ کاروبار پر منفی اثرات ان کی حقیقی سزا نہیں ہے۔ اس لیے ان کی سزا اگر توبہ نہیں کی گئی تو آخرت میں بھی ملے گی۔

اسی کاروبار کے لیے اگر آپ تدبیر کرنے میں غلطی کریں، مثلاً آپ نے جوتوں کی دکان کھولنی تھی اور آپ نے ایک چلتے ہوئے بازار میں دکان کھولی ہے، سودا صحیح ڈالا ہے تو کاروبار چل نکلے گا۔ یعنی آپ کے حسن تدبیر کا بدلہ آپ کو مل گیا، لیکن اگر آپ نے دکان ایسی جگہ پر کھول لی کہ جہاں لوگوں کا آنا جانا کم ہے، صرف محلے والے آتے جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ کاروبار نہیں چل سکے گا۔ گویا آپ کو آپ کی غلطی کی سزا اسی دنیا میں مل گئی، لیکن اس غلطی کی سزا آخرت میں نہیں ملے گی۔ اس لیے کہ یہ محض تدبیری غلطی تھی، دینی اور اخلاقی غلطی نہیں تھی۔

چنانچہ اس طرح کے معاملات میں جو مشکلات آتی ہیں تو وہ ہمارے اپنے کیے کی سزا ہوتی ہے۔ ان پر شکوہ شکایت کرنے کے بجائے اپنے کیے پر نگاہ ڈالنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہم کیا کچھ کر آئے ہیں۔

سبب 18: ہماری شاکلہ

شاکلہ سے مراد ہمارا وہ مزاج اور رویہ ہے، جسے ہم نے اپنی افتادِ طبع، ماحول اور حادثات کے

زیر اثر تربیت کر کے اپنایا ہے۔ مثلاً، ایک آدمی نے اپنی تربیت یہ کر لی ہے کہ وہ نقصانات میں ردعمل کا شکار ہو کر اپنی چیزیں توڑ لیتا ہے۔ ایک آدمی نے اپنے جذبۂ جنس کو بڑھا کر اس کا توازن بگاڑ لیا ہے۔ ایک آدمی نے گھر کی چیزوں کو قرینے سے رکھنے کا جذبہ اتنا بڑھا لیا ہے کہ اب اپنے بیوی بچوں کو ذرا ذرا سی خرابی پر ڈانٹتا رہتا ہے۔ کسی نے اپنی حساسیت کو بہت بڑھا لیا ہے اور کوئی بے حس ہو چکا ہے، یہ سب مختلف شاکلہ ہیں جو انسان دنیا میں آ کر اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ معاملات کرتے ہوئے اس شاکلہ کا لحاظ کرتے ہیں۔

مثلاً، ایک آدمی بہت اچھا ہے، اپنے ارادے اور نیت میں بہت صالح ہے، مگر اسے حالات ایسے ملے ہیں کہ اس کا جذبۂ جنس اس کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ اب دوسری طرف وہ کاروبار میں بھی بہت دیانت دار ہے، مگر کاروبار اس کی دو وقت کی روٹی سے زیادہ نہیں دیتا۔ تو یہ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نیکی کے ساتھ ساتھ اس کی اس خامی سے واقف ہیں اور نہیں چاہتے کہ پیسا ہاتھ آنے کے بعد جنسی آوارگی کی راہ میں اپنی شرافت کھو بیٹھے۔ اس لیے وہ اس کے کاروبار کو کھل کر چلنے نہیں دیتے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمارے بھلے ہی کی خاطر ایک مشکل میں ہمیں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ اصل میں اسی سبب کا دوسرا پہلو ہے جسے ہم ''اللہ کی طرف کے اسباب'' کے تحت ''بڑی مشکلات سے نجات'' کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

سبب 19: اللہ کی تنبیہات پر بیدار نہ ہونا

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مشکلات انھیں بیدار کرنے اور توبہ کا موقع فراہم کرنے کے لیے نازل کرتے ہیں، لیکن اگر آدمی ان پر بیدار نہ ہو تو اور بھی مصائب نازل ہو سکتے ہیں۔

اس کی مثال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں منافقین کے ساتھ اللہ کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے یہ بتایا ہے کہ میں ان کو بار بار برہنہ کرتا رہا تا کہ وہ اپنی حرکت سے باز آجائیں، لیکن یہ پھر بھی توبہ نہیں کرتے۔ سورۂ توبہ میں یہ بات یوں بیان کی گئی ہے:

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ. (۹:۱۲۶)

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ یہ منافق سال میں ایک یا دو مرتبہ ضرور ہماری آزمایش کی پکڑ میں آتے ہیں، مگر یہ پھر بھی توبہ نہیں کرتے، اور نہ نصیحت ہی پکڑتے ہیں۔''

سبب 20: باعث خیر امور کا ترک

قرآن مجید نے یہ اصول صریح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک لوگوں کی حالت تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اس چیز کے تارک نہ ہو جائیں، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر خیر نازل کیا تھا۔

یہ اصلاً اجتماعی اصول ہے، یعنی جن اسباب خیر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عروج دیتا ہے، اگر وہ قوم انھی چیزوں کو اپنے اندر سے ختم کر دے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو زوال کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال میں بنیادی اصول یہی کارفرما ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم پر جن اصولوں کی وجہ سے مہربان ہوا ہوتا ہے، اگر وہ قوم اس خوبی کو ترک کر دے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل کو واپس لے لیتا ہے، اور اس پر برے حالات آنے لگتے ہیں۔

سبب 21: بنیادی دین میں اختلاف

یہ سبب بھی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے۔ جب تک امت تفرقے کا شکار نہیں ہوتی، وہ بنیادی دین پر متفق علیہ رہتے ہوئے فروعات کے اختلافات کو کفر و زندقہ سے تعبیر نہیں کرتی، اس وقت تک افتراق و انتشار کی مشکل امت پر نہیں آتی۔

لیکن جب امت بنیادی دین کو اہمیت دینا چھوڑ دے اور لوگ اپنے جزئی اور فروعی اختلافات کو بنیادی دین قرار دے کر ان اختلافات کی بنیاد پر کفر و زندیقی کے فتوے ایک دوسرے پر لگانے لگیں تو اس وقت امت پر افتراق اور انتشار کی سخت آزمائش نازل ہوتی ہے۔ اگر امت اس پر قابو نہ پائے تو یہ آزمائش خون خرابے کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ پھر مذہب کے نام پر وہ خونچکاں تاریخ رقم ہوتی ہے کہ غیر مذہبی اقوام ان کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور متمدن نظر آتی ہیں۔

قرآن مجید میں سورۂ شوریٰ میں اس کی یہ سزا بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے بعد لوگ دور نہ ہونے والے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو کر دین سے دور ہو جاتے ہیں۔ ہم پاکستان میں عامۃ الناس میں ایسے لوگ بکثرت دیکھ سکتے ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم کس کی بات مانیں؟ دین میں شکوک اور اس پر بے اعتمادی، کسی بھی مذہبی امت کے لیے انتشار و افتراق کا واحد سبب بن سکتے ہیں۔

سبب 22: رسول کی قوم کا کفر

یہ سبب رسول کی قوم کے ساتھ خاص ہے، ایک پہلو سے یہ اجتماعی ہے اور دوسرے پہلو سے انفرادی۔ اب چونکہ رسالت و نبوت کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے، اس لیے یہ سبب اب قیامت تک کے لیے ختم ہو چکا ہے، لیکن ختم نبوت سے پہلے کے دور میں یہ سبب ہمیں پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول کے اتمام حجت کے بعد اس کی قوم کے کفر کے بعد جو عذاب یا مشکلات آتی ہیں، وہ سزا ہوتی ہیں نہ کہ تربیت و اصلاح والی آزمائش۔ اس بات کو ہم ''آزمائش میں کامیابی کا طریقہ'' والی فصل میں واضح کریں گے کہ آزمائش اور عذاب میں کیا فرق ہوتا ہے۔

باب سوم

مشکلات میں مطلوب رویے

مطلوب رویہ 1: آزمائش میں کامیابی کی سعی

پہلے دونوں ابواب میں یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ دنیا آزمائش اور امتحان کے لیے بنی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں جو کام کرنا ہے، وہ یہ کہ ہم اس امتحان میں کامیاب ہو جائیں۔ اس کامیابی میں اولین چیز یہ ہے کہ ہم ہر آزمائش کی آمد پر اپنے ذہن کو فوراً تیار کریں کہ اب ہم امتحان میں ہیں۔ ہمارا ممتحن اللہ ہے۔ ہم نے ایسا رویہ یا ردعمل اختیار کرنا ہے، جو ہمارے ممتحن کو خوش کر دے تاکہ وہ ہمیں اس ٹیسٹ میں کامیاب قرار دے دے۔

اگر ہم مشکلات اور آسانیوں کو امتحان کے رنگ میں نہیں لیں گے تو ہم ان حالات میں صحیح رویہ اختیار نہیں کر سکیں گے اور غلطی کا شکار ہو کر آزمائش میں ناکام ہو جائیں گے۔ اس لیے پہلا کام یہ ہے کہ ہم مشکل ہو یا آسانی، اسے امتحان قرار دیں۔ پھر اس میں کامیاب ہونے کے لیے صحیح سے صحیح عمل جو ہمیں سمجھ میں آ رہا ہو، اسے اختیار کریں۔

مطلوب رویہ 2: صبر

ہر طرح کی آزمائش میں صحیح رویے اور عمل کو اختیار کرنا صبر کہلاتا ہے۔ صبر کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ہر صورت میں صحیح موقف پر قائم رہے۔ اللہ اسے دے تو وہ شکر گزار رہے، فرعون و قارون نہ

بنے اور اللہ چھینے تو وہ صابر رہے، کفر و شرک اختیار نہ کرے، اللہ کے دروازے سے مایوس نہ ہو۔ صحیح موقف سے مراد یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے اخلاق سے نہ گرے۔ اپنے عزیزوں اور اپنے ساتھ برائی کرنے والے لوگوں سے بالخصوص اپنا رویہ صحیح رکھے۔ ان کے حقوق پورے کرے، ان کی عزت قائم رکھے۔ ان سے اگر سہو ونسیان ہوا ہے تو بالخصوص ان سے درگزر کا رویہ اختیار کرے۔ اور اگر ان کی طرف سے دانستہ کوئی چیز سرزد ہوئی ہے تو سزا دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ یہاں بھی پسندیدہ یہی ہے کہ اگر ہو سکے تو انھیں معاف کر دے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ.
(حٰم السجدہ ۴۱:۳۴-۳۵)

”نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتیں۔ تم برائی کا احسن چیز سے دفاع کرو تو تم دیکھو گے کہ جس کے اور تمھارے درمیان عداوت تھی، وہی تمھارا گرم جوش دوست ہوگا، مگر یہ (وہ دانش مندی ہے) جو صرف صبر کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اور یہ صرف ان کو ملتی ہے جو بڑے نصیبے والے ہوتے ہیں۔“

خدا کی طرف سے آنے والی مشکلات میں بھی صبر ضروری ہے۔ ان چیزوں میں آدمی اگر صبر نہ کرے تو وہ مایوس ہو کر کفر و شرک تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کو ہم اپنے معاشرے کی مثال سے سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جب کسی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ علاج معالجہ کراتا ہے، دعائیں کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی جب اولاد نہیں ہوتی تو وہ مایوس ہو جاتا ہے تو پھر وہ لوگوں کے درباروں اور استھانوں کے چکر لگاتا ہے۔ ان کو خدا کی ایک صفت میں شریک وسہیم بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اچھا خاصا آدمی محض اولاد سے محرومی کے دکھ میں شرک کر بیٹھتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ صبر و استقامت سے کام لیا جائے۔

آزمایشوں کے ثمرات حاصل کرنا ایک بڑے نصیبے اور خوش قسمتی کی بات ہے، لیکن یہ اس صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم نے صبر نہ کیا تو مشکلات کے ساتھ آنے والے انعامات سے محروم رہ

جائیں گے۔ قرآن مجید کا فرمان اوپر گزر چکا ہے جس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ آزمایش اور مشکلات سے جو بصیرت اور دانش حاصل ہوتی ہے، وہ صرف انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

مشکلات میں جو کچھ مطلوب ہے، وہ صرف اور صرف صبر ہے اور صبر ہر حالت میں توحید، اعلیٰ اخلاق، ایمان، عدل، حق پرستی اور حوصلے مندی کا نام ہے۔ صبر چونکہ ایک اہم موضوع ہے، اس پر ہم نے ''صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں'' کے نام سے ایک کتاب بھی تحریر کی ہے۔ جو اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے بعد آپ کے ہاتھ میں موجود اس ایڈیشن سے پہلے لکھی گئی ہے، مگر ابھی تک طبع نہیں ہو سکی۔

مطلوب رویہ 3: توبہ

اگر آدمی پر کوئی مصیبت آئے تو سب سے پہلے آزمایش تصور کرتے ہوئے اس کو قبول کر کے صبر سے کام لینا چاہیے۔ اس کے بعد اسے اپنے پچھلے بالخصوص ماضی قریب کے گناہوں کو یاد کر کے ان پر توبہ کرنی چاہیے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما دیں گے، بلکہ وہ ان مشکلات کو ہمارے گناہوں کا کفارہ بھی بنا دیں گے۔ حقوق العباد میں البتہ توبہ کے ساتھ متعلقہ لوگوں سے اپنی غلطی اور گناہوں کو معاف کرانا بھی لازم ہے تاکہ توبہ قبول ہو جائے۔ اس لیے ان لوگوں کے سامنے اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا، ان کو پہنچائے ہوئے نقصان کی تلافی کرنا لازم ہے۔ ورنہ اس کے بغیر یہ توبہ قبول نہیں ہو گی۔

آزمایش کے دوران میں اگر بے صبری ہوئی ہے یا کوئی اور لغزش ہوئی ہے، اس پر توبہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر بھی ایک کتابچہ پیش نظر ہے۔ عنقریب جلد ہی سامنے آ جائے گا۔

مطلوب رویہ 4: حکمت عملی کی تبدیلی

جو مشکلات ہمارے اوپر آتی ہیں، ان کے آنے کے بعد ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اس کام

کو کرنے میں جو تدبیر اور حکمت عملی اختیار کی تھی اور جو اقدامات کیے تھے، آیا وہ صحیح تھے یا نہیں۔ اگر ان میں غلطی معلوم ہو اور آپ کے امکان میں ہو تو ضرور درست کرلیں۔

مطلوب رویہ 5: درجات بلند کرنے کی سعی

آدمی ان مشکلات میں شان دار رویہ اختیار کر کے بلند درجے کے حصول کی کوشش بھی کرسکتا ہے، یعنی ایک آدمی ان مشکلات میں روتے دھوتے کامیاب ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آدمی اس مشکل کو درجات کی بلندی کا ذریعہ بنالے۔ جب مشکل آئے تو وہ اس کا سامنا ایسے کرے جیسا کہ اسے کرنے کا حق ہے۔ وہ خدا کی طرف سے آنے والی ہر آزمایش پر کوئی آہ کھینچے بغیر اس پر پورا اترے۔ اس میں سنت ابراہیمی و مصطفوی صلی اللہ علیہما وسلم کو اپنا اسوہ بنانا چاہیے۔

مطلوب رویہ 6: بغرض تزکیہ کھوٹ کی جانچ

ہم نے اوپر ''اللہ تعالیٰ کی طرف کے اسباب'' کے تحت یہ مقصد بھی جانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کی کھوٹ کو نمایاں کرنے کے لیے بھی ہمیں مشکلات میں ڈالتے ہیں۔ جب ایسا عمل ہوتا ہے تو خود ہمارے سامنے بھی ہماری کھوٹ نمایاں ہو کر آتی ہے تو اس وقت ہمیں ان کو نوٹ کر لینا چاہیے اور ان کے دور کرنے میں اللہ سے طالب مدد ہونا چاہیے اور ان کے صحیح کرنے میں لگ جانا چاہیے۔

باب چہارم

آزمایش میں کامیابی کے ذرائع

صبر

آزمایش میں کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ مشکلوں میں بھی اور آسانیوں میں بھی آدمی صحیح رویے، صحیح عمل اور صحیح ردعمل کا اظہار کرے، اسے ہم نے صبر کا نام دیا تھا۔ امتحان میں وہی آدمی ناکام ہو گا، جو اس صبر پر قائم نہ رہے اور وہی آدمی کامیاب ہوگا جو صبر کے ساتھ صحیح عمل اور رویے کو قائم رکھ سکے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم صبر کے حصول کے لیے کچھ چیزوں کا ذکر کر دیں تاکہ ہم آزمایشوں میں کامیاب ہوتے رہیں۔ مشکلوں میں صبر ایک نہایت مفید چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ صبر سے مدد لو (البقرہ ۲:۴۵)۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہر آزمایش میں صبر سے کام لو، صحیح رویے پر کھڑے رہو اور صحیح طرزِ عمل اختیار کر کے آزمایش میں کامیابی حاصل کرو۔

آزمایش کی حکمتوں کا علم

قرآن مجید نے آزمایشوں کے آنے کے جو اسباب بیان کیے ہیں، جن کا اوپر ہم اپنے علم کی حد تک ذکر کر آئے ہیں، ان کے علم سے بھی آدمی کو صبر حاصل ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ علم آدمی کو وجوہات بتا کر تسلی دیتا اور تسلی کی وجہ سے اسے صبر آ جاتا ہے۔

چنانچہ یہ علم اگر ذہن سے اتر جائے تو اس کو تازہ رکھنا چاہیے اور اس مقصد سے قرآن مجید کا مطالعہ بھی بہت مفید ہے۔ اسی طرح اس موضوع پر اہل علم کی تحریروں کا مطالعہ بھی ایک حد تک مفید رہے گا۔ البتہ قرآن مجید کے مطالعے سے ہماری مراد اس کی تلاوت نہیں ہے، بلکہ اس کو سمجھ کر پڑھنا

مطلوب ہے، اس لیے کہ سمجھے بغیر اس کی تعلیمات سے آگاہی ناممکن ہے۔

نماز (بالخصوص تہجد)

قرآن مجید کے مختلف مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز آزمائش میں کامیابی کے لیے حصول صبر کا سب سے کامیاب ذریعہ ہے۔ قرآن مجید نے بے شمار مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے وقت یہ بتایا ہے کہ تسبیح وتحمید کرو۔ مثلاً سورۂ حجر کی یہ آیات دیکھیے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ. (۱۵:۹۷-۹۸)

''ہم جانتے ہیں کہ تمھارے دل میں ان کی باتوں سے تنگی پیدا ہوتی ہے تو اس موقع پر تم اپنے رب کی تحمید کے ساتھ تسبیح کرو۔ اور سجدہ ریز رہا کرو۔''

ان آیتوں میں دیکھیے کہ تسبیح، تحمید اور سجدہ ریزی کا حکم نماز ہی کی تعبیر ہے، لیکن یہ نماز طوطے کی طرح رٹی رٹائی نماز نہیں ہے، بلکہ شعوری معنی میں تسبیح وتحمید پر مبنی نماز ہے۔ ایسی نماز ہی سے تسلی اور قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ تسبیح وتحمید دراصل ایک بامعنی عمل ہے۔ تسبیح کے معنی ہیں: اللہ کو غلطی سے پاک قرار دینا اور تحمید کے معنی ہیں: اللہ کو اعلیٰ اور قابل تعریف صفات سے متصف ماننا۔ جب بندہ یہ بات دل میں لائے کہ اس وقت میں مشکل میں ہوں، مگر میں اس رب کی دنیا میں جی رہا ہوں جو غلط کام نہیں کرتا، جس کے کسی کام میں کوئی خطا نہیں ہے، جس کے ہر فیصلے میں حکمت ودانائی ہے۔ اس وقت کی مشکل جو میرے اوپر آئی ہے اس میں خدا کا حکیمانہ فیصلہ کارفرما ہے جو یقیناً درست ہے۔ مشکل میں ڈالنے والی ذات کے بارے میں یہ تسبیح اور تحمید دراصل خدا کے بارے میں اطمینان پیدا کر دیتی ہے۔ جب خدا کے بارے میں یہ اطمینان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کا یہ فیصلہ بھی درست فیصلہ ہے اور خدا اس فیصلے کے پیچھے ہے نہ کہ میرا کوئی دشمن تو یہ ایسی تسلی کا سامان کرتا ہے کہ آدمی ہر مشکل آسانی سے سہ لیتا ہے۔ نہ اس کے اندر منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں اور نہ منفی ردعمل۔ اسی لیے قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ 'وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'، ''نماز اور صبر کے

ذریعے سے مدد حاصل کرو۔‘‘(البقرہ ۲:۴۵)

اس مقصد کے لیے بالخصوص تہجد کی نماز حصولِ صبر کا ایک نہایت مفید ذریعہ ہے۔ سورۂ مزمل میں آیا ہے کہ تہجد کی نماز دل جمعی اور قول کی پختگی کے لیے بہت مفید ہے۔ یعنی تہجد کی نماز پانچ وقت کی نماز سے زیادہ موثر ہے، اس لیے کہ زیادہ گہرائی اور توجہ سے پڑھی جاتی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ قرآن ٹھہر ٹھہر کر، یعنی اسے سمجھ سمجھ کر پڑھا جائے، تاکہ تہجد اپنا کام اپنی کامل صورت میں کر سکے۔

سورۂ مزمل میں قرآن مجید نے نماز کی حقیقت دو لفظوں میں بیان کی ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً. ’’اپنے رب کا ذکر کرو اور اس کی طرف خلق (۷۳:۸) سے کٹ کر گوشہ گیر ہو جا۔‘‘

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تہجد ادا کرنے کے لیے فرمایا گیا تھا تو اس کے جو آداب آپ کو سکھائے گئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ اسے یاد دہانی اور ذکر کا ذریعہ بنائیں اور اس کے ذریعے سے خدا کے دامنِ رحمت میں گوشہ گیر ہو جایا کریں۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس حکم کے اثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’...یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طریقہ بتایا اس بات کا کہ جب جب لوگوں کی حق بے زاری اور دل آزاری سے دل آزردہ ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں گوشہ گیر ہو جایا کرو اور اس کے لیے تمھیں اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس کے نام کو یاد کرو۔ جب تم اس کے نام کے ساتھ اس کو یاد کرو گے تو وہ خود تمھیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کی صفات کی تعبیر ہیں اور ان صفات ہی پر تمام دین و شریعت اور سارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہے۔ ان صفات کا صحیح علم متحضر رہے تو آدمی کی پشت پر ایک ایسا لشکرِ گراں اس کے محافظ کی حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ شیطان کی ساری فوجیں اس کی نگاہوں میں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے آپ کو

پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم محسوس کرتا ہے۔اور اگر خدا کی صفات کی صحیح یادداشت اس کے اندر باقی نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو پھر اس کا عقیدہ بے بنیاد یا کمزور ہو جاتا ہے، جس کے سبب سے اس کو منافقین کی طرح ہر بجلی اپنے ہی خرمن پر گرتی نظر آتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/۲۷-۲۸)

یہی وہ ذکر ہے جس سے خدا کے دامن رحمت میں گوشہ گیری کی راہ کھلتی ہے۔ان صفات کی یاد ایک حصار کی طرح ہمارے گرد محافظ بن کر موجود رہتی ہے۔جیسے ایک بچہ کسی خوفناک چیز سے ڈر کر اپنی ماں کی گود میں پناہ گیر ہو کر ساری دنیا کے خوف و دہشت سے بے نیاز ہو جاتا ہے، ٹھیک ویسے ہی ایک بندہ اس یاد کے تازہ ہونے کے بعد خدا کے دامن رحمت میں چھپ کر سارے غم بھول جاتا ہے۔طرح طرح کے حملوں سے اپنے آپ کو مامون خیال کرتا ہے۔

نماز کا یہی وہ پہلو ہے کہ اگر اسے نماز میں پیدا نہ کیا جائے تو نماز اپنے اثرات پیدا نہیں کرتی۔ پھر اس کے بعد آدمی طرح طرح کے مصنوعی سہارے تلاش کرتا ہے، اسے ان کا نشہ تو لگ جاتا ہے، مگر مسئلے حل نہیں ہوتے اور غم دور نہیں ہوتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔(المستدرک، رقم ۲۶۷۶) آپ حضرت بلال کو کہا کرتے: ''اے بلال، نماز سے ہمیں راحت پہنچاؤ۔'' (احمد بن حنبل، رقم ۲۲۰۰۹)

یہ دنیا شیطان کی نہیں

نماز دراصل ہمیں اللہ کی طرف لے جاتی ہے۔ہمیں یہ شعور دلاتی ہے کہ ہم اللہ کے سہارے پر ہیں جو ہمارا پروردگار ہے۔ ہمارا آقا و مالک ہے۔اس نے ہمیں پیدا کیا ہے تو ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

جبکہ اگر ہمارا یہ خیال بن جائے جیسا کہ توہم پرستوں کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کچھ شیطانی قوتیں کارفرما ہیں۔ایسے لوگ مشکلات میں ایسے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ مشکلات ان کے لیے مایوسی لے کر آتی ہیں اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اب وہ اس سے نکل ہی نہیں سکتے۔اگر نکلنا

ہے تو پھر ان شیطانی قوتوں کو دے دلا کر راضی کرنا پڑے گا، حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے نہایت کریم اور نہایت محبت کرنے والے خدا کی دنیا ہے۔ جس کے ہاں صرف توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کسی ایسی مشقت میں ڈالنے والا نہیں ہے جس میں شیطانوں کے چکر اور بھول بھلیاں ہوں۔ جس کی آزمائشوں میں تاریکیاں اور نہ ٹلنے والی مشکلیں ہوں۔ ہاں، اس کی دنیا میں مہلک بیماری بھی ہے، اس کی دنیا میں جان لیوا حادثات بھی وجود پذیر ہوتے ہیں۔ زندگی بھر کی معذوریاں بھی اس کی اس دنیا میں سامنے آتی ہیں، لیکن یہ سب کی سب اعلیٰ مقاصد کے لیے ہیں۔ اگر ہم ان مشکلات میں صابر رہے تو اس کے بعد ہمیں وہ کامیابی ملنے والی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے 'الفوز الکبیر' (بڑی کامیابی) کا نام دیا ہے۔

بعض لوگ لمبی آزمائش سے گزرتے ہیں۔ سال ہا سال کی آزمائشیں ان کا حوصلہ ختم کر دیتی ہیں اور وہ مایوسی کے قریب جا پہنچتے ہیں، لیکن اگر وہ حقیقت کا جائزہ لیں تو وہ صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان کی تمنائیں پوری نہیں ہو رہی ہوتیں، لیکن دوسری خوشیاں ان کے گھر میں ہر روز آتی ہیں، مگر وہ صرف اس لیے خوشی نہیں بن پاتیں کہ ان کی خاص تمنائیں پوری نہیں ہوئی ہوتیں، جس وجہ سے وہ غم زدہ رہتے ہیں۔

ہونا یہ چاہیے کہ وہ ہر خوشی کو خوشی مانیں، اس سے حوصلہ پائیں اور اپنی خاص تمنا کا چراغ سینے میں ضرور جلائے رکھیں۔ ایک لطیفہ نما کہانی سنائی جاتی ہے: ایک گاؤں میں نہایت ہی نیک بزرگ رہتے تھے۔ انھوں نے ساری زندگی عبادت میں گزاری تھی۔ گاؤں کے کسی آدمی کو کبھی کوئی تکلیف ان سے نہیں پہنچی تھی۔ ان کی نیکی کا اردگرد کے علاقوں میں خوب چرچا تھا۔ اس بزرگ کے بارے میں ایک اور بات یہ بتائی جاتی تھی کہ انھوں نے کبھی بھی خدا سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا تھا۔ دوسروں کے لیے دعائیں تو کرتے تھے، مگر اپنے لیے نہیں۔

ایک دفعہ یوں ہوا کہ اس گاؤں میں سیلاب آ گیا۔ لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ سب لوگ ان کے پاس آئے اور کہا: بابا جی، چلیے گاؤں ڈوب رہا ہے، مگر بابا جی نے کہا: نہیں، میں نہیں

جاؤں گا۔ دوسری طرف انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے اللہ، میں نے آج تک تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج بھی اپنے لیے صرف ایک ہی چیز مانگ رہا ہوں کہ تو خود آ کر مجھے بچا۔

سیلاب کا پانی چڑھتا گیا۔ جب ان کے گھٹنوں تک پانی آ گیا تو فوج کے جوان ان کے پاس آئے، انھوں نے بابا جی سے کہا کہ آیئے، ہم آپ کو محفوظ جگہ لے چلتے ہیں۔ بابا جی نے کہا: نہیں، تم لوگ جاؤ، مجھے اللہ بچا لے گا۔ فوجیوں نے کچھ اصرار کیا، مگر پھر چلے گئے۔ پانی ان کے دھڑ تک آ گیا، پھر گاؤں کے کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہو کر جا رہے تھے تو انھوں نے بابا جی سے کہا کہ آ جائیں۔ بابا جی نے کہا: نہیں، تم لوگ جاؤ اللہ مجھے بچا لے گا۔ لوگوں نے اصرار کیا، بابا جی نہیں مانے۔ سو یہ لوگ بھی چلے گئے۔ پانی چڑھتے چڑھتے ٹھوڑی تک آ گیا، پھر فوجیوں کا ایک گروپ آیا مگر بابا جی نے وہی کہا۔ پانی ناک تک آ گیا، بابا جی نے دیکھا کہ ایک شہتیر بہتا ہوا آ رہا ہے۔ خیال ہوا کہ اس کو پکڑ کر ڈوبنے سے بچ جاؤں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نہیں مجھے اللہ خود آ کر بچائے گا، اس شہتیر کو بھی نہیں پکڑا۔ پانی نے بابا جی کے پاؤں اکھاڑ دیے، وہ ڈوبنے والے تھے کہ ایک درخت بہتا ہوا آیا۔ وہ اسے پکڑ کر بھی بچ سکتے تھے، لیکن انھوں نے پھر کہا کہ مجھے تو اللہ بچائے گا۔ میں غیر اللہ کا سہارا کیوں لوں۔ اور بالآخر وہ ڈوب کر موت کی آغوش میں چلے گئے۔

ان کی جب پیشی ہوئی تو انھوں نے اللہ سے شکوہ کیا کہ اے اللہ، تو نے مجھے بچایا ہی نہیں، میں نے تو آپ سے زندگی بھر میں ایک چیز اپنے لیے مانگی، مگر وہ بھی آپ نے نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تمھاری دعا سن لی تھی اور قبول بھی کی۔ میں نے دو دفعہ تمھیں بچانے کے لیے فوجی بھیجے، دو دفعہ گاؤں والے لوگ تمھارے لیے بھیجے، لکڑی کا شہتیر بھیجا، بہتا ہوا درخت بھیجا، لیکن تم نے خود میرا کوئی سہارا قبول نہیں کیا۔ اب مجھ سے شکوہ کیوں کرتے ہو۔

یہ کہانی میں نے اس لیے سنائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سی خوشیاں ہمیں مل رہی ہوتی ہیں، مگر ہم اپنی کسی خاص خوشی کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خوشی کو ہمارے لیے مناسب نہ پا رہے ہوں، لیکن ہم اسی خوشی کے انتظار میں ہلکان ہو رہے ہوتے ہیں،

جبکہ دوسری خوشیاں ایک کے بعد دوسری ہمارے پاس سے ہو کر گزر جاتی ہیں۔

خوشی اور غم کی آفات

خوشی کی بھی ایک آفت ہے، جسے قرآن 'فرح فخور' کے الفاظ سے بیان کرتا ہے اور غم کی بھی ایک آفت ہے جسے قرآن 'یئوس کفور' کے الفاظ سے بیان کرتا ہے۔ خوشی کی آفت کو قرآن مجید نے سورۂ ہود میں یوں بیان کیا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّىْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ. (۱۱:۱۰)

''اور اگر ہم انسان کو لاحق ہونے والی مشکل کے بعد نعمتوں کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: لو اب میری مشکلیں دور ہو گئیں، اور یوں وہ 'فرح فخور' (خوشی میں مگن اور مغرور) بن جاتا ہے۔''

اور غم کی آفت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ. (ہود ۱۱:۹)

''اور اگر ہم انسان کو اپنی خاص رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں، پھر وہ رحمت اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ 'یئوس و کفور' (مایوس اور ناشکرا) بن جاتا ہے۔''

یہ مایوسی اور ناشکرا پن نتیجہ ہے، دو اور آفات کا جن کو قرآن مجید نے ''وہن'' اور ''حزن'' کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ جب آدمی پر کوئی مشکل آتی ہے یا اس کا نقصان ہوتا ہے تو اس پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے، جس کو وہن، بے دلی یا بے ہمتی کہہ سکتے ہیں، یہ بے دلی حزن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حزن اپنی ابتدائی شکل میں تو محض دکھ کے احساس کا نام ہے، مگر اپنی اصل صورت میں یہ نہایت مہلک چیز ہے، اس لیے کہ اس کو اگر انسان اپنے اوپر طاری کر لے تو انسان نہ صرف دنیوی کاموں میں بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ دینی معاملات میں بھی وہ حزن سے آگے

بڑھ کر ناشکرا اور بالآخر الحاد و کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے صحابہ کو جنگوں کی حالتوں میں پہنچنے والے غم و غصے میں فرمایا کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا ''نہ بے دل ہونا اور نہ غم کرنا۔'' (آل عمران ۳:۱۳۹)

حزن دراصل شیطانی حربوں میں سے ہے۔ شیطان اپنے حربوں سے مسلمانوں کے دلوں میں حزن کی حالت پیدا کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف انسان قلق و اضطراب (Frustration and depression) کی حالت میں چلا جاتا ہے، بلکہ ردعمل کی منفی نفسیات میں پڑ کر دین، رشتہ داروں اور حتیٰ کہ اللہ و رسول کے خلاف بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ اور اگر ان کے خلاف نہ بھی بھڑکے تو دشمن ہی کے خلاف بھڑک کر بے حکمتی کے ساتھ معاملہ کر گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کی صفوں میں آ کر منافقین اپنی چالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں غم اور حزن پیدا کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا:

إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا. (المجادلہ ۵۸:۱۰)	''یہ سرگوشیاں شیطانی ہیں، اس لیے کی جاتی ہیں کہ اہل ایمان کو غم زدہ کر دیں۔''

چنانچہ یہ واضح ہے کہ شیاطین مختلف حربوں سے مسلمانوں کو غم زدہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا خدا پر توکل اور بھروسا کمزور پڑ جائے، اس لیے کہ حزن حلم اور تحمل کا قاتل ہے۔ حلم اور تحمل ہمارے اندر وہ قوت پیدا کرتے ہیں کہ ہم مشقتوں کو برداشت کر سکیں، مگر حزن ہمارے اندر ایسا وہن اور کمزوری پیدا کر دیتا ہے کہ ہم مشکلات کے تحمل کے قابل نہیں رہتے، جس کے بعد ہر منفی کام شیطان ہم سے کرا سکتا ہے۔

مشکلات عمل صالح ہیں

قرآن مجید نے صحابہ کو ایک نہایت ہی دل پذیر بات جنگوں میں پہنچنے والے مصائب کے بارے میں یہ کہی کہ جتنی مشقت اور چوٹ تم میرے راستے میں سہتے ہو، اس کے بدلے میں تمھارے لیے ایک عمل صالح لکھ دیا جاتا ہے:

لَا یُصِیبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ وَلَا یَطَئُونَ مَوْطِئًا یَغِیظُ الْکُفَّارَ وَلَا یَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا کُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِینَ. (التوبہ۹:۱۲۰)

''ان (مسلمانوں) کو اللہ کی راہ میں نہ کوئی پیاس کی تکلیف آتی ہے، نہ کوئی تھکن لاحق ہوتی ہے، نہ بھوک کی گھڑی آتی ہے، یا وہ دشمن کے لیے تکلیف دہ جگہوں کو طے کرتے ہیں، نہ دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر یہ کہ اللہ اس کے بدلے میں ان کے لیے ایک عمل صالح لکھ دیتے ہیں اور اللہ ان نیکوکاروں کا اجر بالکل ضائع نہیں کریں گے۔''

یعنی جب اللہ کی خاطر، کوئی بندہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عمل کرتا ہے اور اس عمل کے دوران میں وہ کسی مشقت اور تکلیف سے گزرتا ہے تو ہر تکلیف کے بدلے میں اس کے لیے ایک ویسا ہی عمل صالح لکھ دیا جاتا ہے۔

مشکلات عذاب نہیں

ہم بالعموم، اپنے اوپر آنے والی آزمایشوں کو غلط رنگ دے لیتے ہیں۔ کبھی انھیں اللہ کی ناراضی سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ کبھی اسے معمولی سا حادثہ سمجھ کر بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں رویے غلط ہیں۔ اگر ہم خدا کے بندے ہیں اور ہمارے سینوں میں ذرا سا بھی خدا کا تصور موجود ہے تو ہمیں خدا کے بارے میں ایسی بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔

عذاب اللہ تعالیٰ کی سزا ہے جو کافروں پر آتا اور انھیں ہلاک کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہ بالعموم رسولوں کے زمانے میں آتا ہے۔ رسولوں کے زمانے کا یہ عذاب جو نوح، صالح، شعیب اور لوط علیہم السلام جیسے پیغمبروں کی قوموں پر آیا، اصل میں کفار کو جہنم واصل کرنے کا عذاب تھا۔ اس کا تعلق آزمایش سے قطعاً نہیں ہے۔

جبکہ مشکلات ہمیں ہلاک کرنے کے لیے نہیں آتیں، یہ ہمیں اوپر بیان کردہ مقاصد کے تحت

اونچا اڑانے کے لیے آتی ہیں۔ یہ مارنے نہیں، زندگی عطا کرنے آتی ہیں۔ یہ مشکلات نہیں، بلکہ ہمارے لیے ہادی و رہنما ہیں۔ یہ ہماری ہم راہی ہیں، اگر ان کا ساتھ نہ ملے تو نہ ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم غلط چل رہے تھے اور نہ ہمیں یہ علم ہو سکتا ہے کہ خدا دیکھتا اور جانتا ہے۔

ہم اندھے ہیں اور یہ ہماری لاٹھی ہیں جو ہمیں قدم قدم پر بتاتی ہیں کہ اب چڑھائی ہے اور اب اترائی۔ اب راستہ ہموار ہے اور اب دشوار۔ یہ اگر آئیں تو سمجھیں خدا نے ابھی ہمیں بھلایا نہیں، یہ نہ آئیں تو فکر ہونی چاہیے کہ کہیں خدا نے ہمیں بھلا تو نہیں دیا۔

جو شخص مشکلات کو عذاب سمجھتا ہے، وہ خدا سے مایوس ہونے میں تیزی دکھائے گا۔ اور جو شخص ان مشکلات کو امتحان اور اپنا مفید زادراہ سمجھے گا، وہ ان کے اندر بھی خدا کو جیتا جاگتا پائے گا۔ اور قدم قدم پر اپنے لیے اور اپنے ایمان کے لیے تازگی کا سامان پائے گا، اس لیے کہ ایسا شخص ہمیشہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ دنیا چونکہ ایک باقاعدہ مقصد سے بنی ہے، اس لیے یہاں پر ہر خوشی اور غم اسی مقصد کے تحت آتی اور جاتی ہے، اس لیے جب اس کی نگاہ اس مقصد پر ہوگی، اسے غم اور حزن نہیں ستائیں گے۔

دنیا، جیسا کہ ہم نے پیچھے جانا ہے، آزمایش کے لیے بنی ہے، اس لیے عام طور پر مشکلیں سزا کے لیے نہیں، اسی آزمایش ہی کے لیے آتی ہیں، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ ہماری کسی غلطی کی وجہ سے آئی ہوں۔ عذاب صرف اس وقت آتا ہے جب اللہ کا رسول آکر حق کو بالکل واضح کر دیتا ہے اور لوگ پھر بھی اس کا انکار کر دیں۔ اس سے پہلے ہر حادثہ اور ہر مشکل محض آزمایش ہے۔

پاکستان میں ایک شدید زلزلہ ۲۰۰۵ء میں آیا۔ اس زلزلے نے وادیٔ کشمیر کے ہزاروں لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سوال پیدا ہوا کہ آیا یہ اللہ کا عذاب ہے یا نہیں۔ مذہب سے گریزاں لوگوں نے کہا کہ یہ ایک ارضیاتی مسئلہ ہے، ہر چیز میں خدا کو نہ گھسیٹا کرو۔ ایسے زلزلے انسانوں کے دنیا میں پیدا ہونے سے پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ اور اب بھی آرہے ہیں۔ اس وقت بھی یہ ارضیاتی مسئلہ تھا اور اب بھی۔ اگر یہ انسانوں کے گناہوں کی وجہ

سے آتا ہے تو انسانوں سے پہلے نہیں آنا چاہیے تھا۔

مذہبی لوگوں کے دو گروہ تھے: ایک کا کہنا تھا کہ یہ عذاب ہے اور دوسرے گروہ کا یہ کہنا تھا کہ یہ آزمایش ہے، عذاب نہیں ہے۔ جو لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ یہ عذاب ہے، وہ پرانی قوموں کے عذابوں کے مماثل انھیں سمجھ رہے تھے۔ اور جو لوگ اسے محض مشکل گھڑی اور آزمایش سمجھ رہے تھے، وہ اس آیت سے استدلال کر رہے تھے کہ 'وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا' ''ہم ہرگز عذاب نہیں دینے والے جب تک کہ کسی رسول کو نہ بھیج دیں۔'' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۵)

یہ بات درست ہے کہ یہ عذاب نہیں تھا، اس لیے کہ اس سے پہلے کشمیریوں کے لیے کوئی رسول نہیں آیا تھا، لیکن پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے عذاب کی نوعیت کے یہ زلزلے اور طوفان آخر کیوں آتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن مجید کی سورۂ مرسلت میں مختصر مگر جامع طریقے سے دیا گیا ہے:

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا. فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا. وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا. فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا. فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا. عُذْرًا اَوْ نُذْرًا. اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ. (۷۷:۱-۷)

''وہ ہوائیں جن کی باگ کھلی چھوڑ دی جاتی ہے، پھر وہ تند ہو کر طوفان بنتی ہیں، پھر بادلوں کو بکھیرتی ہیں، پھر الگ الگ (علاقوں سے) الگ الگ معاملہ کرتی ہیں۔ چنانچہ دلوں میں یاد دہانی ڈالتی ہیں، کبھی قطع عذر کے لیے اور کبھی محض ڈرانے کے لیے۔ یہ ہوائیں اس بات پر گواہ ہیں کہ قیامت ہونے والی ہے۔''

یہاں دیکھیے کہ ہواؤں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے طوفان مختلف طرح سے آتے ہیں۔ کسی قوم پر 'عُذْرًا' یعنی قطع عذر کے لیے اور کسی پر 'نُذْرًا' یعنی ڈرانے کے لیے۔ قطع عذر کے معنی اتمام حجت کے ہیں۔ یہ معاملہ بلاشبہ رسولوں کے ساتھ خاص ہے۔ اس لیے کہ انھی کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کے آنے کے بعد دلیل کی گنجایش نہیں رہتی۔ (النساء ۴:۱۶۵) رہا معاملہ نذر کا یعنی ڈرانے کا تو یہ عام انسانوں کے ساتھ بھی ہے اور رسول کی قوم کے ساتھ بھی۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ عام حالات میں بھی اور رسولوں کی زندگی میں بھی اس طرح کے طوفان ڈرانے اور خدا کی یاددہانی دلوں میں ڈالنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ یاد اس طرح دلوں میں ڈالی جاتی ہے کہ بہت سی اموات ایک ہی وقت میں اکٹھی کردی جاتی ہیں۔ عذاب والے طوفان صرف عذاب یا قطع عذر کے لیے رسولوں ہی کے زمانے میں آتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے اوپر جو بھی مشکلیں آتی ہیں، وہ یاددہانی کے لیے آتی ہیں یا دوسرے مقاصد کے لیے جن کا ذکر ہم اس کتاب کے پچھلے ابواب میں کر آئے ہیں۔

تقدیر پر ایمان

قرآن مجید کا فرمان ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر ٹھہرائی اور پھر اسے اس کی تقدیر کے راستے پر چلا دیا۔ گویا آدمی نیکی اور بدی جو کماتا ہے وہ تو اپنی آزادی اور اختیار سے کماتا ہے، لیکن جو مقام اور مرتبہ اسے حاصل ہوتا ہے اور جو مال و دولت اسے حاصل ہوتی ہے وہ اس کی تقدیر کا لکھا ہوا اسے ملتا ہے۔ اس لیے نہ اسے غربت پر کڑھنا چاہیے اور نہ اپنی دولت و عزت پر نازاں ہونا چاہیے۔

یہ سب کچھ ایسے ہی ہے، جیسے اچھی اور بری صورت والا ہونا۔ نہ اچھی صورت تکبر و غرور کی وجہ ہے اور نہ بڑی سے بڑی دولت۔ یہ سب کچھ اللہ کی تقدیر ہے جو اس نے اپنی خاص حکمتوں کے ساتھ ٹھہرائی ہے۔ جن میں کچھ حکمتوں کو ہم نے اوپر سیکھا ہے۔ آدمی کی شکل و صورت، اس کی صلاحیتیں، اس کا مال و دولت، سب کا تعلق اس کی قسمت سے ہے نہ کہ اس کے ذاتی استحقاق اور اس کی قابلیت کا صلہ اور حق، اس لیے ان کا ہونا یا نہ ہونا منشائے الٰہی ہے جس کا مقابلہ حوصلہ اور دانش مندی سے کرنا چاہیے۔

پائی ہوئی نعمتوں کا تذکرہ

اگر کوئی مشکل آدمی پر آئے تو آدمی کو اچھے دنوں کو یاد کرنا چاہیے جن میں اللہ نے اس پر

عنایتیں کی ہوتی ہیں۔ اور یہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر اللہ نے وہ دن دکھائے تھے اور گزر گئے تو یہ دن بھی باقی نہیں رہیں گے، یقیناً اچھے حالات نصیب ہوں گے۔ اس سے بھی آدمی کو صبر اور تسلی حاصل ہوتی ہے۔ سورۂ الم نشرح میں یہی طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

اوپر بیان کردہ حصول صبر کے یہ تینوں طریقے اصل میں خدا کے ساتھ آدمی کے تعلق کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ آدمی کا یہ شعور جتنا گہرا ہوگا، اتنا ہی اس کا خدا سے تعلق گہرا اور مستحکم ہوگا۔ اور جتنا اس کا تعلق اس سے گہرا ہوگا، اسی قدر وہ مشکلات میں صبر کر سکے گا۔

لیکن ہم ان نعمتوں سے حقیقی معنی میں فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اگر ہم ان مشکلات میں اللہ سے طالب مدد نہ ہوں۔ بعض تصورات کو صحیح کیے بغیر اللہ سے مدد طلب کرنا بسا اوقات ناممکن ہوتا ہے اور بسا اوقات بے معنی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کو صحیح کر لیا جائے۔

اللہ کی صفات اور سنن کا علم

اس امتحان کی سختی اور نرمی کے اصول کو جان لینے کے بعد، یہ جان لینا بھی از حد ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو سمجھا جائے کہ جن کو جاننے سے ہمیں نہ صرف یہ کہ تسلی حاصل ہو، بلکہ وہ حکمت بھی سامنے آئے جو ہمارے لیے مشکلات سہنے میں مدد و معاون ہو۔ اللہ کی صفات کا علم ہمارے ذہن میں وہ تصورات بٹھا دیتا ہے، جن کی روشنی میں ہم بہت سے امور کی حکمت کو جان لیتے ہیں۔ جس کے جان لینے کے بعد مشکلات کی تلخی اور شدت میں کمی آجاتی ہے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی صفات کے اس علم کی وجہ سے ہمارے اندر خدا کی طرف سے امید اور سہارا ملنے کی توقع پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بھی ہمارے لیے مشکل وقت میں حوصلہ افزا ثابت ہوتی ہے۔ ان صفات میں سے ایک صفت علیم ہے۔

علیم

اللہ صاحب علم ہے۔ دنیا میں ہونے والا ہر واقعہ ازل سے اس کے علم میں ہے۔ اس کے لیے کوئی چیز حادثہ نہیں ہے۔ وہ غیب اور ظاہر دونوں کو جانتا ہے۔ یہاں ایک بات ضمناً عرض کرنا چاہتا

ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اس سے کسی بھی حالت میں جدا نہیں ہوتیں۔ٹھیک اسی طرح اس کی صفت علم بھی ہر وقت اس میں موجود رہتی ہے۔ چنانچہ جب ہم پر کوئی مصیبت اتری ہو،تو یہ ہرگز خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ اس سے بے خبر ہوگا یا یہ کہ اسے تو اس کا علم نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمارا یہ نظریہ کہ وہ ہر واقعے کو جانتا ہے، ہمارے لیے باعث تسلی و اطمینان بننا چاہیے اور ہمارے لیے سہارا بننا چاہیے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ جب ہمارے اوپر کوئی مصیبت آئے تو یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ ہمارا مالک و آقا اس سے بے خبر ہے۔اب ہمارا پرسان حال کوئی نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس یہ خیال کرنا چاہیے کہ دنیا ہماری اس مصیبت سے بے خبر ہے، مگر وہ کارساز اس سے واقف ہے، جس نے اسے اس مصیبت سے نکالنا ہے۔

جب آدمی کو مصیبت کے وقت یہ یاد رہے کہ اس کی مشکلات دور کرنے والا اس کی مصیبت سے باخبر ہے تو یہ اس کے لیے ایک بڑا سہارا ہے جو اسے بلا معاوضہ اور بلا انقطاع میسر رہتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ وہ ہماری صلاحیتوں، ہماری افتاد طبع، ہماری دلی خواہشات اور ہمارے حالات کا نہایت باریکی سے علم رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہمیں کسی مشکل میں ڈالے گا تو ان تمام پہلوؤں سے وہ مشکل آزمائش نہایت نپی تلی اور متوازن ہوگی۔اگر ہم صحیح ذہن کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں تو ہم بلاشبہ آزمائش کی اس بھٹی سے کندن بن کر نکلیں گے۔

حکیم

اللہ صاحب حکمت ہے۔دنیا میں ہونے والا ہر واقعہ اس کی دانائی، بصیرت اور اس کے حکیمانہ مقاصد کا حامل ہوتا ہے۔ ہماری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہیے کہ یہ مصیبت کتنی بڑی ہے، بلکہ اس پر ہونی چاہیے کہ یہ کیوں آئی ہے، اس لیے کہ اس حکیم وخبیر سے یہ توقع نہیں کہ وہ بلا وجہ ہمیں کسی ابتلا میں ڈال دے گا۔ وہ یقیناً درج بالا مقاصد ہی کے لیے ہمیں آزماتا ہے۔اس کے حکیم ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ہر کام کو حکمت پر مبنی سمجھا جائے، اس لیے کہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اس کی یہ صفات اس سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں ہوتیں، اس لیے یہ جان لینا چاہیے کہ اگر وہ کسی کو سزا بھی دے رہا ہو تو وہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔

اس کو ہم ایک ادنیٰ درجے پر ماں کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں، جو اپنے بچے کو بدتمیزی کرنے یا محنت نہ کرنے پر صرف اس لیے سزا دیتی ہے کہ اس کی عادتوں کا بگاڑ اس سے دور ہو یا اس کا مستقبل تاریک نہ ہو۔ ماں کے ذہن کی یہ حکمت بعض اوقات بیٹے سے اوجھل ہوتی ہے اور وہ ماں سے باغی ہو جاتا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ اگر ماں اپنے بیٹے پر یہ ستم اس لیے توڑتی ہے کہ وہ سدھر جائے، اس کا مستقبل سنور جائے، وہ آنے والے دنوں میں پریشان نہ ہو تو کیا خدا ماں سے زیادہ حکیم نہیں ہے؟ اور وہ اس سے زیادہ مستقبل سے باخبر نہیں ہے؟ یہی اس کا علیم و حکیم ہونا ہے جو ہمارے لیے باعث اطمینان ہے۔

اس حکمت کا ایک پہلو یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ بسا اوقات ہم یہ خیال کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا کاروبار چل جانا چاہیے، ہمیں ملازمت مل جانی چاہیے، ہمارے ہاں اولاد ہونی چاہیے۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا علم یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے لیے مستقبل میں نقصان کا باعث ہوگا۔ وہ ہمیں اس نقصان سے بچانے کے لیے اس سب کچھ سے محروم رکھتا ہے۔ اوپر ہم واقعۂ موسیٰ و خضر کو تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔ ایک نگاہ اس بحث پر دوبارہ ڈال لیجیے۔

رؤف ورحیم

مشکلات میں اللہ کی جو صفات ہمیں بدرقہ و سہارا فراہم کرتی ہیں، وہ رؤف ورحیم کی صفات ہیں۔

رؤف

رؤف اس ذات کو کہتے ہیں جو دوسروں کی مشکلات دور کرنے والی، ان کو کلفتوں سے نکالنے کا اہتمام کرنے والی ہو۔ جبکہ رحیم اس ذات کو کہتے ہیں جو عنایت و مہربانی کرنے والی ہو۔ لوگوں کے لیے استحقاق یا بلا استحقاق نعمتیں نازل کرنے والی ہو۔ گویا رحمت عام ہے اور رافت خاص جو اس وقت متحرک ہوتی ہے، جب آدمی مشکل میں گھرا ہوا ہو۔

اس صفت کے تذکرے سے جو باتیں میں سامنے لانا چاہتا ہوں، ان میں سے ایک بات یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت یہ تو ہے کہ وہ مشکلات میں سے نکالتا ہے، لیکن یہ نہیں ہے کہ وہ مشکلات میں ڈالتا ہے۔ البتہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بھوک، جان جانے کے خوف اور نقص اموال سے ہماری آزمایش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم ایسی ذات کے بارے میں جو رؤف ورحیم ہے، ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ وہ خواہ مخواہ ہمارے اوپر مصائب نازل کرتا رہتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ جب بھی ہمیں مشکل میں ڈالتا ہے تو وہ محض مشکل میں ڈالنے کے لیے ایسا نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصد جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہماری بھلائی ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو حقیقت میں رافت کا تقاضا یہی ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۷ میں یہ صفت 'وَ اللّٰہُ رَءُ وْفٌ بِالْعِبَادِ' (اللہ اپنے بندوں کے لیے رؤف ہے) کے الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب نہایت درجہ دل نواز ہے۔ اسی طرح یہ صفت سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں 'اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُ وْفٌ رَّحِیْمٌ' کے الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ یہ صفت جہاں آئی ہے، وہ مقام اس صفت کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے، اس لیے ایک نظر اس مقام پر ڈال لینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے تبدیلی قبلہ کا حکم دے کر اس متوقع ردعمل کا ذکر کیا ہے جو بالخصوص یہود کی طرف سے سامنے آنے والا تھا۔ وہ صدیوں سے بیت المقدس کو قبلہ بنائے ہوئے تھے۔ اب اس قبلہ سے ہٹنا ان کے لیے بہرحال ایک دشوار کام تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیتے ہی فرمایا ہے کہ اللہ نے یہ حکم امت مسلمہ کو کاملاً دین ابراہیمی پر قائم کرنے کے لیے دیا ہے اور اس لیے دیا ہے کہ وہ یہ پرکھے کہ کون رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں واپس چلا جاتا ہے۔

اس حکم کے یہ دونوں مقصد بتانے کے بعد فرمایا کہ بلاشبہ یہ کام مشکل ہے، لیکن ہم نے یہ حکم اس لیے نہیں دیا کہ ہم تمھارا ایمان ضائع کر دیں۔ اللہ تو لوگوں کے ساتھ رؤف ورحیم ہے۔

یہاں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ قبلہ کی تبدیلی جیسی ایک بڑی آزمایش میں ڈالنے کے بعد جس کے مشکل ہونے کو خود رؤف ورحیم نے تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ میں رؤف

ہوں، اس لیے تم پر ایسی آزمائش نہیں ڈالوں گا جس کی وجہ سے تم ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ اسی اصول کو اس نے ایک عمومی اصول کے طور پر بھی بیان کیا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا ' (اللہ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ آزمائش کا بوجھ نہیں ڈالتا)۔ یہاں اس وسعت سے مراد آزمائش کے لیے قوت برداشت ہے، یعنی آدمی پر ایسی آزمائش نہیں ڈالی جائے گی کہ اس کی قوت برداشت سے زیادہ ہو جائے اور وہ کفر پر مجبور ہو کر ایمان سے محروم ہو جائے۔ اگر اللہ ایسی آزمائش آدمی پر ڈال دیں تو یہ اس کے نزدیک قرین انصاف نہیں ہے کہ وہ اس پر گرفت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کی طرح، پاگل اور بے ہوش آدمی کے جرائم کا مؤاخذہ نہیں ہے۔

مقصد تخلیق

دوسری بات رافت کے پہلو سے سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ رؤف ورحیم کی نظر تخلیق آدم کے اس مقصد پر رہتی ہے کہ اس نے اسے آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے، نہ کہ اس دنیا میں ہمیشہ کی زندگی گزارنے کے لیے، جبکہ ہم اکثر اوقات اس حقیقت کو فراموش کیے رہتے ہیں۔

وہ ایک ہمدرد ماں کی طرح جو اپنے نالائق بچے کے مستقبل سے پریشان رہتی ہے، اسے کبھی ڈانٹتی ہے کبھی کوستی ہے، کبھی پیار سے بہلاتی پھسلاتی ہے، کبھی لالچ دیتی اور کبھی سزا کی وعید سناتی ہے۔ ذرا اس نگاہ سے ان آزمائشوں کو دیکھیے اور سوچیے کہ وہ کتنا پیار کرنے والا، کتنا خیر خواہ اور کس قدر مشکلات سے نکالنے والا ہے۔

وہ اس احمق ماں کی طرح (نعوذ باللہ) نہیں ہے جو اپنے بچے کو اس لیے چلنا نہیں سکھاتی کہ کہیں گر کر اسے چوٹ نہ آجائے۔ وہ جہاں جاتی ہے، اسے گود میں لیے رہتی ہے۔ بظاہر وہ بیٹے کی ہمدرد ہے، لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ اپنے بیٹے کی دشمن ہے۔ اسے بیٹے کے ان دنوں کی پروا نہیں ہے جب وہ اسے گود میں اٹھا کر کہیں نہ لے جا سکے گی۔ پھر یہی بیٹا اسے گالیاں دے گا کہ تو نے مجھے چلنا کیوں نہیں سکھایا؟ تم نے میرے ساتھ یہ دشمنی کیوں کی؟ اور وہ اسے یہ نہ کہہ سکے گی کہ میں نے تو تمھاری ہمدردی کی تھی۔

جس ماں نے اپنے بیٹے کو پاؤں چلنے کے لیے مشکلات میں نہیں ڈالا، وہ اس وقت ہمدرد نظر آتی تھی، مگر وہ حقیقت میں ''رؤف'' نہیں تھی اور جس نے اپنے بیٹے کو بچپن میں مشکل میں ڈالا، وہ اُس وقت سخت نظر آتی تھی، مگر حقیقت میں وہ رؤف و ہمدرد تھی۔

ہم چونکہ بچوں کی طرح اپنے ''مستقبل'' کو اکثر فراموش کیے رہتے ہیں، اس لیے ہمیں وہ ''ماں'' اچھی لگتی ہے، جو ہماری ''آج'' کی راحت کا خیال رکھتی ہے، جبکہ دور اندیش آدمی کو وہ ''ماں'' اچھی لگے گی، جو اس کے ''کل'' کی راحت کو بھی ملحوظ رکھے۔ اللہ ایسی ہزار ماؤں سے بھی زیادہ ہمدرد ہے، اس لیے مشکل سے مشکل وقت میں بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ یقیناً ہمیں ''پاؤں چلنا'' سکھا رہے ہیں اور سیکھنے کے دوران میں ٹھوکریں تو ہمیں لگیں گی۔

رحیم

ایک نظر اب 'رحیم' کی صفت پر بھی ڈال لیجیے۔ رحیم اس ذات کو کہتے ہیں جو عنایت و مہربانی کرنے والی ہو۔ لوگوں کے لیے استحقاق یا بلا استحقاق نعمتیں نازل کرنے والی ہو۔ رحمت کے چند اہم پہلو سمجھنا حصول صبر کے لیے نہایت ناگزیر ہے۔ رحمت اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے کہ اس سے بعض مکاتب فکر نے عجیب و غریب فلسفے تراش رکھے ہیں، جس کی وجہ سے بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کی نفی ہو جاتی ہے، کہ وہ کوئی با اصول ذات ہے بھی یا نہیں؟ آیئے اب رحمت کے حوالے سے چند باتیں سمجھ لیں:

سزا اور مشکلات رحمت کا حصہ ہیں

رحمت کو ایک اور پہلو سے بھی سمجھ لینا چاہیے، عام تصور اس کے بارے میں یہ ہے کہ اس میں صرف عنایت و شفقت ہی شامل ہے، لیکن قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سزا بھی رحمت کا لازمی حصہ ہے، اس کے بغیر رحمت کا تصور تکمیل نہیں پاتا۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کریں کہ ایک ماں کے دو بیٹے ہیں۔ ایک شرارتی ہے اور دوسرا شریف اور سیدھا سادھا ہے۔ شریر بچہ کسی موقع پر شریف کو تنگ کرتا ہے تو ماں جو دونوں بیٹوں کی یکساں ماں ہے، وہ اس طرح کے موقع پر ہمیشہ یہ نہیں کر سکتی کہ اپنے شریف بچے کو دلاسا دے کر چپ کرا دے، بلکہ اسے

شریر بچے کو سزا بھی دینا پڑتی ہے تاکہ شریف بچے کا دل ٹھنڈا ہو اور اسے محسوس ہو کہ دوسرے کی شرارت سے جو تکلیف اس نے اٹھائی تھی، اس کی سزا اب دوسرے کو مل گئی۔ اگر وہ ماں ایسا نہ کرے تو وہ شفیق ماں نہیں ہے۔ ماں کے اس رویے سے معلوم ہوا کہ شفقت ایک بچہ کی سزا کے بغیر تکمیل نہیں پاتی۔

ٹھیک اسی اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (الانعام ۶:۱۲)

''اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، اس لیے وہ ضرور قیامت کے دن تمھیں جمع کرے گا۔''

ناانصافی رحمت کے خلاف ہے

یہاں دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اکٹھا کر کے حساب کتاب کو اپنی رحمت کا تقاضا قرار دیا ہے۔ رحمت کا یہی وہ اصول ہے، جس سے عدل پھوٹتا ہے۔ چنانچہ ساری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ معاشرے میں ہونے والے جرائم کی سزا دی جائے تاکہ مجرمین کے لیے عبرت کے ساتھ ساتھ، مظلوم کی دادرسی بھی ہو، اس لیے ساری دنیا اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں میں ثالثی، پنچائت، جرگہ اور عدالتیں قائم کرتی ہے تاکہ معاشرے میں عدل قائم ہو۔ اور یہ ایک ظالم معاشرہ بن کر نہ رہ جائے۔ گویا عدالتی نظام ایک رحمت ہے جس کی ساری دنیا طالب ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ قاتل اور چور کو ان کے کیے کی سزا دراصل رحمت اور تسلی کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے قوم قریش کے انجام بد کی خبر دی تو فرمایا:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ. (التوبہ ۹:۱۴)

''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دینا چاہتا ہے، وہ انھیں شکست و رسوائی سے دوچار کرے گا اور تمھیں ان پر غلبہ و نصرت عطا کرے گا اور اس طرح مومنین کے سینے ٹھنڈے کرے گا۔''

مراد یہ ہے کہ سزا کی تکمیل صحابہ کے سینوں کی ٹھنڈک کے بغیر نامکمل ہے۔ سورۂ انعام میں یہی وجہ ہے کہ کفار کی جڑ کٹنے پر اللہ کا شکر ادا کیا گیا ہے:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. ''سو، اللہ پروردگار عالم کا شکر ہے کہ ظلم کرنے والوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔''

(۶:۴۵)

ظاہر ہے کہ شکر کا حقیقی موقع رحمت وعنایت ہے، اسی لیے یہاں اس عنایت پر خدا کا شکر کیا گیا ہے کہ دنیا ان لاخیروں سے پاک کر دی گئی اور اس سے مظلوموں کی دادرسی ہوئی۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ جب ہم پر کوئی مشکل نازل ہو تو اسے رحمت الٰہی کے خلاف نہ سمجھیں۔ اس موقع پر وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو بیماری کے موقع پر تجویز فرمایا تھا کہ اس بیماری کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھو۔

جیسا ہم نے عرض کیا کہ اللہ کی کوئی صفت کسی وقت بھی اس سے جدا نہیں ہوتی، اس لیے خیال رہنا چاہیے کہ اس کی صفت 'رحمۃ' اس کی صفت 'قائم بالقسط' سے جدا ہو کر عمل نہیں کرتی، بلکہ وہ جب رحم کرتا ہے تو کبھی بھی انصاف اور قسط کے خلاف نہیں ہوتا۔

اس کو ایک تمثیل سے سمجھیے: ایک آدمی پر اللہ کی ہر عنایت لگتا ہے کہ آسمان سے براہ راست برس رہی ہے۔ دنیا کی کوئی نعمت نہیں جو اس کے گھر میں نہ ہو، مگر اس کا کردار اور اس کا عمل نہایت سرکشی اور نہایت دین ناپسندی، بلکہ کفر کا ہے تو کیا اس پر اللہ کی رحمت قرین انصاف ہے؟

ہر آدمی جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے فطرت ودیعت ہوئی ہے، جس میں نیکی کا شعور اس کی حلاوت اس کے لیے اجنبی نہیں ہے، اس لیے یہ دنیا طلب آدمی بھی نیکی کرتا ہے۔ اگرچہ وہ دنیا میں شہرت پانے یا محض قلبی تسکین کے لیے کرتا ہے۔ تو 'انما الأعمال بالنیات' (اعمال کا دورومدار نیتوں پر ہے) کے اصول پر اسے دنیا میں اس کا اجر ملنا چاہیے۔ اگر انھیں دنیا میں اجر نہ ملے اور آخرت میں بھی ان کی ان نیکیوں کا اجر نہ ملے تو یہ ناانصافی ہوگی۔

اس لیے اسے یہ اجر مختلف صورتوں میں دے دیا جاتا ہے: کسی کو معاشرے میں بلند منصب عطا کر کے، کسی کو شہرت یا دولت دے کر کسی کو گرُو اور پیشوا بنا کر اور کسی کو مقتدر اور فرعون بنا کر، غرض جو صورتیں اس دنیا کے تنگ نائے میں ممکن ہیں، ان سب صورتوں میں کسی کی نیکی کے مطابق اسے اجر مل جاتا ہے۔ اس طرح ایک نیکی گویا ایک تدبیر کا درجہ پا کر آخرت تک جانے سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نیکی اس طرح کرتے ہیں کہ انھیں دنیا ہی میں اجر مل جائے تو انھیں یہ اجر دنیا ہی میں مل جائے گا۔ البتہ آخرت میں ان کے حصے کچھ نہیں آئے گا۔ اس لیے دیکھیے کہ ایک بے انصافی والی ''رحمت'' کتنا بڑا انصاف ہے۔

اصل مسئلہ: آخرت

انسان ہر وقت نسیان کی وجہ سے اپنی منزل کو بھول کر راستے ہی کو منزل سمجھ لیتا ہے۔ اسے آخرت کی تیاری کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اپنی ساری مساعی اسی دنیا کو بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چونکہ اللہ تعالیٰ کو نسیان لاحق نہیں ہوتا، اس لیے وہ مسلسل ہماری آخرت کے لیے تیاری کے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہم ایک مشکل جو بلاشبہ سنگین ہو سکتی ہے، اس پر روتے رہتے ہیں، جبکہ آخرت کی ناکامی سے بڑی مصیبت کوئی نہیں ہے۔ ہمیں اگر وہ پریشانی یاد ہو تو ہمیں دنیا کی مشکلات کبھی اتنا پریشان نہ کریں، اگر ہم انھیں اپنا زادِ سفر بنا لیں۔

اس لیے اللہ کے نزدیک اس دنیا کی بڑی سے بڑی تنگی بھی دوزخ کی تنگی سے بڑی نہیں ہے۔ کسی عورت پر ظلم ہونا، اسے طلاق ہو جانا، کسی عورت کا بے اولادی کی وجہ سے بے گھر کیا جانا، ساس اور بہو کے جھگڑوں میں اس پر الزام لگنا، کسی کا کاروبار ٹھپ ہو جانا، اگر کسی کو ان میں سے گزر کر جنت ملنے والی ہو تو اللہ کے نزدیک یہ معمولی باتیں ہیں۔

وہ جانتا ہے کہ ایک بیوہ، ایک مطلقہ یا ایک الزام زدہ عورت یا ظلم و ستم کا ستایا ہوا کوئی آدمی جو بھی ان آزمایشوں میں کامیاب ہو کر جنت میں آ جائے گا، وہ ان مشکلات کو اپنے لیے نعمت سمجھے

گا، کیونکہ اگر وہ مشکلات اس پر نہ آتیں تو وہ دوزخ کی مصیبت سے نجات نہ پا سکتا۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے: جس ماں کے تین بچے مر گئے اور وہ صابر و شاکر رہی تو یہ غم اس کے جنت میں جانے کا سبب بن جائیں گے۔

اس کو بھی ماں ہی کی مثال سے سمجھتے ہیں۔ ماں جب اپنے بچے کو چھری چاقو سے کھیلتے ہوئے دیکھتی ہے تو اس سے وہ چاقو چھین لیتی ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ جانتی ہے کہ اس وقت چھری سے محروم ہونا اتنی بڑی تکلیف نہیں ہے، جتنی بڑی تکلیف اس چھری سے اسے ہاتھ کٹ جانے کی وجہ سے ہو گی۔ اس لیے وہ بچے کے چیخنے اور چلانے کے باوجود اس سے چھری چھین لیتی ہے۔ اور اگر وہ چپ نہ کرے تو وہ اسے مزید ڈانٹ بھی دیتی ہے۔

اس سے ہمیں اللہ کی پے در پے آزمائشوں کا بھی ایک سبب معلوم ہو جاتا ہے کہ جب ہم اللہ کی کسی آزمائش پر صحیح رویہ اختیار نہیں کرتے تو وہ ہمیں مزید ڈانٹتا ہے تاکہ ہم سنبھل جائیں۔

جنت کی یاد

آخرت اگر اصل مسئلہ ہے تو پھر مشکلات اور تنگیوں میں جنت کو یاد کرنا چاہیے۔ قرآن مجید نے بار بار جنت کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ اس کی بشارت سے دل مطمئن ہوتے اور اس کی وجہ سے حوصلہ مندی پیدا ہوتی ہے جو مشکل وقت میں بھی نیکی پر قائم رہنے میں مدد دیتی ہے۔

خدا کی ربوبیت اور اس کا حکیمانہ کنٹرول

ہم بالعموم ان مشکلات پر زیادہ غضب ناک ہوتے ہیں جو ہمارے دوستوں یا عزیز رشتہ داروں کے کسی اقدام کی وجہ سے ہم پر آتی ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشرے میں چغلی، غیبت، ٹانگ کھینچنا، دھوکا دہی، زر اور زمین کے جھگڑے ایسے عام جرائم ہیں کہ آدمی ان سے پریشان ہو کر دوستوں سے جھگڑ پڑتا، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کر لیتا، ان کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیوں کا

شکار ہو جاتا، ماں باپ کو گھر سے نکال دیتا، حتیٰ کہ بعض اوقات انھیں یا اپنے آپ کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سارے جھگڑوں کو آزمایش کے طور پر نہیں لیتا۔ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ اپنی پوری آزادی سے کر رہے ہیں، اس لیے اگر میں انھیں ختم کر دوں، ان سے ناتا توڑ لوں، ان کو گالیاں دے لوں، ان کو ماروں پیٹوں تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ ایسے اقدامات کے بعد مزید مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

ایسا شخص اصل میں اللہ کی ربوبیت اور اس کی حکمت کا انکار کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر اور اس کے حکیمانہ فیصلوں کے خلاف روبہ عمل نہیں ہوتا۔ جب صورت حال ایسی ہے تو کیا یہ رشتہ دار، یہ غیبت و چغلی کرنے والے جو یہ سب کچھ کر رہے ہیں آیا خدا کی اجازت و مہلت کے بغیر کر رہے ہیں؟

اگر ہم یہ انکار کر دیں کہ وہ اللہ کی دی ہوئی مہلت کے بغیر ایسا کر رہے ہیں تو یہ خدا کی الوہیت و حکیمانہ کنٹرول کا انکار ہے اور اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اللہ ہی نے مہلت دی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ کی یہ مہلت بلا وجہ نہیں ہوگی۔ اس کے پیچھے درج بالا مقاصد میں سے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پیش نظر ہوگا، یعنی ہماری اصلاح، ہمارے گناہوں کو جھاڑنا وغیرہ۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اب اپنے ان ساتھیوں کی کارگزاری کو دیکھیے تو جو گناہ و خطا وہ کر رہے ہیں، وہ اگرچہ اپنی مرضی سے کر رہے اور اس سے وہ یقیناً گناہ کما رہے ہیں، لیکن مہلت چونکہ اللہ نے دی ہے، اس لیے وہ ہماری تربیت اور آزمایش کا سامان بھی کر رہے ہیں۔

وہ ہمارے اوپر ظلم ڈھانے جیسا کبیرہ گناہ کر رہے ہیں، مگر ہمارے لیے صبر کرنے کی صورت میں جنت کی راہ کھول رہے ہیں۔ ابولہب اور ابوجہل کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے ایک طرف ان کے لیے دوزخ تعمیر کی تو دوسری طرف صحابہ رضوان اللہ علیہم کے کردار کی تعمیر کی۔ وہ جیسے جیسے یہ حرکتیں کرتے گئے، صحابہ کا ایمان مضبوط ہوتا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا

نظام ایسی حکمت اور تدبیر سے بنایا ہے کہ ایک شر بھی وجود میں آتا ہے تو سو خیر اپنے دامن میں لے کر آتا ہے۔

اس نقطہ کے حل ہونے کے بعد جب میں اپنے گردونواح میں لوگوں کو اپنے اوپر الزام دیتے، طعنے دیتے، طرح طرح کی سازشیں کرتے دیکھوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں انھیں اپنا دشمن قرار دوں، میرے تو وہ محسن ہیں دشمن تو وہ اپنے ہیں۔ وہ میری تربیت کا سامان اپنا نقصان کر کے کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کو طعنے کا جواب دینے کے بجائے مجھے ان کی اصلاح کا سوچنا چاہیے، ان پر ترس آنا چاہیے کہ وہ اپنی تباہی کے گڑھے کھود کر مجھے ان میں اترنا اور اتر کر نکلنا سکھا رہے ہیں۔

لیکن مجھے یہ فائدہ بس اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ جب میں ان کی ان حرکات کو اللہ کی آزمائش سمجھ کر اسے اپنی تربیت واصلاح کا ذریعہ بناؤں۔ اگر میں نے ان کی اینٹ کے جواب میں پتھر اٹھا کے دے مارا تو میں بھی ان جیسا ہوں۔ میں نے بھی غلطی کا ارتکاب کر ڈالا ہے۔ اس کے بعد خیر کا دروازہ میرے لیے بند ہو جائے گا۔

حدیث میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ملتا ہے کہ کوئی صاحب ان کو گالیاں دیتے رہے اور کچھ دیر تک ابو بکر چپ رہے، لیکن کچھ دیر بعد انھوں نے بھی جواب دینا شروع کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر آپ نے انھیں بتایا کہ جب تک تم خاموش رہے تو فرشتے جواب دیتے رہے اور جب تم جواب دینے لگے تو وہ چلے گئے۔ ایک طرح سے اللہ ان کی طرف سے دفاع کرتا رہا۔ فرشتوں کا جواب دینا غیر مسموع تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ گالیوں کے جواب میں کیا جواب دیتے رہے ہوں گے، لیکن وہ جو کچھ تھا، ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک خیر تھا، جس سے وہ جواب دینے کے بعد محروم ہو گئے۔

ٹھیک اسی طرح کی محرومی کا شکار ہم ہو جاتے ہیں، جب ہم برائی کے جواب میں برائی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم دوسروں کی برائی کا ان سے بدلہ جائز اور عادلانہ طریقوں سے لے سکتے ہیں۔ لیکن انھیں معاف کرنا 'حظِ عظیم' کا پانا ہے۔

قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ تم کسی کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو۔ اس کے الفاظ ہیں کہ تم کسی کی برائی کو نیکی سے دھکیل کر ہٹا دو۔ بجائے اس کے کہ تم بدی کو دھکیلنے میں بدی ہی کی راہ اختیار کرو تو یہ تمھیں اللہ کی عنایتوں سے محروم کر دے گا۔ اگر تم اس کی راہ میں زندگی بسر کرو اور لوگوں کی برائی کا دفاع نیکی سے کرو تو اس سے نہ صرف یہ کہ تمھارا دشمن تمھارا عزیز دوست بن سکتا ہے، بلکہ تم بھی وہ خوش قسمت بن جاؤ گے جنھیں خدا اپنی حکمتوں سے نوازتا ہے۔ دیکھیے قرآن مجید نے اس رویہ کو ایک بڑی خوش بختی قرار دیا ہے اور اسے صبر کا ثمرہ قرار دیا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ.

(حم السجدہ ۴۱: ۳۴-۳۵)

”نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتیں۔ تم برائی کا احسن چیزوں سے دفاع کرو تو تم دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے درمیان عداوت تھی، وہی تمھارا گرم جوش دوست ہو گا، مگر یہ وہ دانش مندی ہے، جو صرف صبر کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اور یہ صرف ان کو ملتی ہے جو بڑے نصیبے والے ہوتے ہیں۔“

آیے اب ہم مشکلات کی آزمایش میں سے کامیاب ہونے کے لیے جن باتوں کو ملحوظ رکھنا ہے، ان کو اپنے سامنے رکھیں تاکہ ہم پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس آزمایش میں کامیابی کیا ہے، اور ناکامی کیا ہے۔

کامیابی کے چند پہلو

نیکی پر قائم رہنا

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام نیکیوں اور تمام برائیوں کی اصل کو بیان کیا ہے۔ اس آیت کو

میں یہاں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ اس آیت کو یاد کرلیا جائے تو وہ تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ اس پر اگر ہم تمام امور کو پرکھیں تو ہمیں آسانی سے برائیاں بھی سمجھ میں آجائیں گی اور نیکیاں بھی، وہ آیت یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. (النحل ۱۶:۹۰)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو اپنے مال میں سے دینے کا۔ اور اللہ تعالیٰ روکتا ہے فحاشی و بے حیائی سے اور منکر (حق تلفی سے) اور دوسروں کے خلاف تعدّی اور بغاوت سے، اللہ تمھیں اس کی نصیحت اس لیے کرتا ہے، تا کہ تمھیں یاددہانی ہو۔''

اس آیت کی بعض باتوں کی وضاحت ذیل کی آیت سے ہوتی ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۳)

ان آیات سے گناہوں اور نیکیوں کی ایک بنیادی فہرست ہمارے سامنے آتی ہے۔ جن کے تحت پھر تمام نیکیاں اور برائیاں آجاتی ہیں۔ اب ہم ان نیکیوں اور برائیوں کو ایک ایک کر کے مختصر طور پر سمجھتے ہیں۔

عدل

یہ پہلی نیکی ہے، جسے اللہ نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر کسی کا جو حق ہے، وہ اسے دیا جائے۔ جو اللہ کے حق ہیں، وہ بھی پورے کیے جائیں اور جو بندوں کے حق ہیں، وہ بھی ان کو دیے جائیں۔ اللہ کے حقوق میں توحید، بندگی اور اطاعت کے حقوق قائم ہوتے ہیں، جن کی خلاف ورزی سے شرک اور گناہ پیدا ہوتا ہے، ان کو ہم منکر کہہ سکتے ہیں۔ بندوں کے حقوق

میں ان کی عزت، مال اور جان کے پہلو سے بہت سے حقوق قائم ہوتے ہیں۔ان کی خلاف ورزی سے بھی گناہ پیدا ہوتا ہے، ان کو بھی ہم اوپر کی آیات کی روشنی میں منکر کہہ سکتے ہیں۔ جب ہم پر اللہ کی طرف سے یا بندوں کی طرف سے کوئی مشکل آئے تو ہم نے کوشش کرنی ہے کہ اللہ کے حقوق بھی اس صورت میں پامال نہ ہوں اور نہ بندوں کے حقوق میں خرابی پیدا ہو۔

احسان

اس آیت میں دوسری نیکی احسان کے لفظ سے بیان ہوئی ہے۔ احسان کے معنی حسن سلوک کے ہیں، حسن سلوک بندوں کے ساتھ بھی اور عملوں کے ساتھ بھی۔ بندوں کے ساتھ حسن سلوک کے معنی یہ ہیں کہ ان کی برائی پر ہم ان سے بدلہ لے سکتے ہیں، مگر بدلہ لینے کے بجائے ان کو معاف کر دیں یا یہ ہوسکتا ہے کہ مثلاً ہم سے کوئی نیکی کرے تو ہم اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ نیکی کر دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ سلام کا جواب اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسا ضرور دیا کرو۔

اعمال کے ساتھ حسن سلوک کے معنی یہ ہیں کہ نیک عمل کرتے وقت پورے خلوص اور محنت سے اچھی طرح کیا جائے۔ اسی کو حدیث جبریل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان کیا کہ تم اللہ کی بندگی یوں کرو، گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو یا یہ کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جب تم یہ خیال کرو گے کہ اللہ کو تم دیکھ رہے ہو یا اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے تو تم نہایت توجہ اور محنت سے وہ نیکی کرو گے۔ قرآن مجید میں احسان انھی دو معنی میں آیا ہے۔ یہاں اس تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔ بس یہاں یہ بات کہنا پیش نظر ہے کہ کسی کی برائی پر ہم بدلہ ضرور لے سکتے ہیں۔ اس کی اسلام نے اجازت دی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ اس کے بدلے میں ہم دوسرے کو اتنی ہی تکلیف دیں جتنی اس نے ہمیں دی ہے۔ لیکن احسان کی نیکی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم بدلہ لینے کے بجائے اس کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گالی کے جواب میں دعا دیتے اور برے سلوک کے بدلے میں حسن سلوک کرتے تھے۔ کسی نعت خواں نے خوب کہا ہے کہ:

رسول پاک کی سیرت کا یہ کتنا حسین رخ ہے!
خدائے پاک سے دشمن کے حق میں بھی دعا کرنا

احسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک پہلو سے یوں سمجھایا ہے:

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۳۴)

''وہ لوگ جو تنگی اور خوشحالی دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔ اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں۔ اللہ ایسے احسان کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔''

ایتاء ذی القربیٰ

اس آیت میں تیسری نیکی یہ بیان کی گئی ہے کہ ہم اپنے رشتہ داروں کو ان کی ضرورت کے وقت اپنے مال سے دیں۔ یہ ایک مانی ہوئی نیکی ہے، لیکن یہ اس وقت ناممکن ہوجاتی ہے جب یہ عزیز اور رشتہ دار ہمارے ساتھ کوئی برائی کردیتے ہیں۔ پھر ہم اپنی جیب میں سے ایک روپیہ بھی ان کے لیے نہیں نکالتے۔ مشکلات میں نیکی پر قائم رہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم رشتہ داروں کی یہ مدد ان کی برائی کے باوجود بھی ترک نہ کریں۔

فحشاء

اس آیت میں برائیوں کی فہرست میں سب سے پہلی برائی 'فحشاء' ہے۔ فحشاء بے حیائی کا مترادف ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم فحش حرکات سے لے کر زنا تک کی ہر جنسی برائی سے بچیں۔

منکر

اس آیت میں دوسری برائی منکر ہے۔ منکر عدل کا الٹ ہے، یعنی دوسروں کے حق مار لینا۔ حق مارنے میں کچھ امور تو واضح ہیں، جیسے کسی کے پیسے بٹورنا، کسی کو دھوکا دینا، ان کے بارے میں بری باتیں معاشرے میں چغلی و غیبت کے ذریعے سے پھیلانا، ان پر بہتان لگانا، انھیں رسوا کرنا وغیرہ،

مگر کچھ چیزیں منکرات کی نوعیت کی واضح نہیں ہوتیں، ان کو ہم یہاں بیان کررہے ہیں:

بد ظن نہ ہونا

جب ہم پر مشکل آتی ہے تو ہم اللہ کے بارے میں بھی اور لوگوں کے بارے میں بھی بدظنی کا شکار ہوسکتے ہیں، اس لیے جب آدمی پر مشکلات آجائیں اور وہ گردشوں میں گھر جائے تو اسے سب سے زیادہ جس بات کا دھیان رکھنا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے یقیناً میرا بھلا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہم اوپر کی بحث میں اچھی طرح سمجھ آئے ہیں کہ مشکلات سے اللہ ہمارا بھلا کس طرح چاہتے ہیں۔ مشکلات آئیں تو ہمیں اللہ کے اور قریب لے جائیں۔ اسی بات کو احادیث مبارکہ میں 'رضیت باللّٰہ ربا' (میں اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوں) کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح لوگوں کی غلطی پر بھی ان کی طرف بدگمانی نہیں ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر ہم نے الگ سے ایک کتابچہ بھی تحریر کیا ہے۔ اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کا نام ہے: ''بدگمانی کیا ہے، اس سے کیسے بچیں؟''۔

جب ہمیں کوئی تکلیف اپنے قریب رہنے والے لوگوں سے ملتی ہے تو ہم ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے لگتے ہیں، حالانکہ بعض اوقات دوسرے لوگ ہماری بھلائی میں کچھ کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کی بھلائی ہمارے لیے نقصان دہ ہوجاتی ہے۔ تو ایسے موقع پر ہمیں ان کے بارے میں برا گمان نہیں کرنا چاہیے۔ صرف اسی حد تک ہمیں ان کے بارے میں رائے بنانی چاہیے، جتنی معلومات ہمارے پاس ہوں۔

قرآن مجید نے اس بارے میں ہمیں یہ فرمایا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا.	''وہ موقف مت اختیار کرو جس کا تمھارے پاس نہ علم ہو (اور نہ بنیاد)، اس لیے کہ کان، آنکھ اور دل سب سے باز پرس ہونی ہے۔''

(بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)

دوسرے موقع پر قرآن مجید نے یہ بھی فرمایا ہے کہ رائے ان معلومات پر مبنی ہونی چاہیے جو تحقیق شدہ ہوں، سنی سنائی باتوں پر عمل نہیں ہونا چاہیے۔

شرک نہ کرنا

اللہ کے حوالے سے منکرات میں سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ اللہ کی سب سے بڑی حق تلفی ہے۔ مشکلات میں کبھی کبھی آدمی پر یہ وقت آجاتا ہے کہ جب لوگ اسے یہ بتاتے ہیں کہ فلاں شخص ہر مراد پوری کر دیتا ہے اور فلاں ''باباجی'' ہر مشکل حل کر دیتے ہیں تو آدمی یہ خیال کرنے لگ جاتا ہے کہ شاید اللہ تو یہ نہیں کرے گا تو یہ بزرگ یقیناً ایسا کر دیں گے۔ یہیں سے شرک کا وہ سارا بازار گرم ہوتا ہے جس سے حق کی شاہ راہ سے ضلالت کی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں۔

شرک کے بارے میں بھی یہاں اصولی بات کو جان لیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ''سن رکھو کہ تخلیق بھی اللہ نے کی ہے اور اس خلق کا کنٹرول اور تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بابرکت ہے اللہ تعالیٰ جو عالمین کا پروردگار ہے۔'' (الاعراف ۷:۵۴) مراد یہ ہے کہ دنیا کو جس طرح اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، اسی طرح اس کے چلانے میں جن فیصلوں کی اور جن احکامات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی اللہ ہی صادر کرتا ہے، اس لیے اگر کسی کے گھر میں بیٹا نہیں ہوا تو یہ اللہ رب العزت ہی کا فیصلہ ہے، اس میں کوئی یہ مانے کہ اس کا حکم نہیں چلتا یا کوئی دوسرا اس کے حکم کو تبدیل کر سکتا ہے یا اس کے حکم کے ہوتے ہوئے کسی اور کا جادو چل سکتا ہے تو یہ سب کچھ شرک ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ ہماری امت میں یہی شرک عام ہے۔ اللہ ہمیں اس سے بچائے۔

مایوس نہ ہونا

قرآن مجید میں مایوس ہونے کو کفر کرنے والوں کا عمل بتایا گیا ہے۔ اور مصائب و مشکلات میں کفر وہی شخص کرتا ہے، جسے خدا کے بارے میں صحیح علم نہ ہو۔ وہ جذبات میں آکر بھول جائے کہ اللہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی مصائب میں اللہ کے اگلے فیصلے کا مایوس

ہوئے بغیر انتظار کرے۔ آج وہ جس مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہے کل ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے لیے ایک روشن مستقبل لے کر آ رہی ہو۔ مایوسی اللہ کی ذات کی نفی ہے۔ بندۂ مومن اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ. (یوسف ۱۲:۸۷)	’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔‘‘

اللہ پر افترا

منکرات میں سے یہ بھی ایک منکر ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ اللہ کے نام پر جب بھی کوئی بات کہی جائے تو ضروری ہے کہ وہ کسی ثبوت کے ساتھ ہو۔ اگر آپ نے وہ بات خود سے گھڑ لی ہے تو یہ ایک بڑا گناہ ہے۔ مشکلات کے وقت غلط دینی تعبیریں اور غلط قسم کے فتووں کا حصول اسی ضمن میں آئے گا۔

بغی

نیکیوں اور برائیوں سے متعلق مذکورہ آیت میں اگلی برائی جو بیان کی گئی ہے، وہ ’بغی‘ ہے۔ یہ لفظ وہی ہے جس سے بغاوت کا لفظ نکلتا ہے۔ بغاوت اللہ کے خلاف بھی ہوتی ہے اور انسانوں کے خلاف بھی۔ اللہ کے خلاف بغاوت خدا کے مقابلے میں سرکشی ہے، جس کی سب سے گھناؤنی مثال زمانۂ رسالت میں رسول کے خلاف ہونا ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جسے قرآن فساد فی الارض کہتا ہے۔ آج کل بم رکھ کر دنیا میں دہشت گردی کرنے کا جو عمل چل رہا ہے، وہ یہی فساد فی الارض ہے۔ یہ نہایت کبیرہ گناہ ہے۔

انسانوں کے خلاف بغاوت ان کے حقوق پر غاصبانہ ڈاکا ہے۔ مثلاً منکر یہ ہے کہ آپ میرا مال چرا لیں۔ اور بغی یہ ہے کہ آپ مجھ سے تلوار یا بندوق کے زور پر میرا مال چھین لیں۔ منکر یہ ہے کہ آپ زنا کریں اور بغی یہ ہے کہ زنا بالجبر کریں۔ اس کی سنگین ترین صورت انسانوں کے اوپر ظالمانہ طرز کی حکومت ہے، جس میں لوگوں کی جان، مال اور آبرو سب ہر وقت خطرے میں ہو۔ ان کو خدا کی دنیا میں خدا کے قانون اور دین کے مطابق جینے کا حق نہ دیا گیا ہو۔

حق پرستی

مشکلات سے بار ہا یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ ہمارا موقف کسی بات کے بارے میں غلط تھا۔ اس کی غلطی واضح ہونے کے بعد آدمی کا صبر یہ ہے کہ حق پر قائم رہنے کے لیے غلط رائے کو ترک کر دے۔ اور یہ خیال ہرگز نہ کرے کہ میں نے اتنے لوگوں کے سامنے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی ہے تو آیا اب میں اس سے رجوع کرلوں۔ نہ یہ کہے کہ ''میں نے اتنی محنت سے یہ سلسلہ چلایا تھا'' کیا اب اسے ختم کر دوں یا یہ سوچے کہ میں نے سب کے سامنے یہ بات کہہ رکھی ہے، کیا اب سب کے سامنے غلطی کا اعتراف کر کے شرمندگی اٹھاؤں یا یہ سوچے کہ اتنے لوگوں کو اس بات پر جمع کرلیا ہے تو حق کا اعتراف تو کرلوں، لیکن یہ سب کچھ کہیں بکھر نہ جائے!

غلطی کا اعتراف اور توبہ

مشکلات میں بعض اوقات ایسی مشکل بھی سر پر آ پڑتی ہے جیسی مشکل سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر آئی جب انھوں نے ان پر یہ ظاہر کیا کہ وہ ان کے بھائی یوسف ہیں۔ ایسے موقع پر صبر کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف متعلقہ لوگوں کے سامنے کرلیا جائے۔

خدا کا معاملہ بھی ہو تو پھر خدا سے بھی توبہ کر لینی چاہیے۔ توبہ اور غلطی کا اعتراف دراصل برائی کے راستے کو چھوڑ کر واپس نیکی پر آنا ہے۔ اگر آدمی ایسا نہ کرے تو وہ غلطی پر جمار ہے گا۔ بعض لوگ لوگوں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک بڑی برائی ہے، اس لیے کہ آپ کا اعتراف نہ کرنا بعض اوقات دوسرے کے لیے اذیت یا ذلت کا سبب بن رہا ہوتا ہے۔

بداخلاق نہ ہونا

اگر آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتا، تو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ دوسروں کے ہاتھوں زک پہنچنے پر آدمی اخلاقی رویوں میں کمزور نہ ہو۔

وہ دوسروں کی صریح غلطی کے باوجود غم وغصہ کا اظہار بھی کرے تو اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے کرے اور وہ آداب کو ملحوظ رکھے، دین وشریعت کا پابند رہے، عدل وانصاف کو ہاتھ

سے نہ جانے دے۔

اس ضمن میں درج ذیل باتوں کو سمجھ لینا چاہیے:

غصہ

ہم لوگوں کے ساتھ بداخلاقی سے اس وقت پیش آتے ہیں جب ہمیں ان پر غصہ ہو۔ غصہ نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی برائی کے جواب میں غصہ میں نہیں آنا چاہیے، بلکہ جیسے ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ فوراً ان کی برائی کے جواب میں سوچیں کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس سوال کا ایک جواب تو ہمیشہ یہی ہے کہ یہ سب میری آزمائش کے لیے ہے۔ تو جیسے ہی آپ کا یہ شعور بلند ہوگا تو آپ کو جذبات کی رو سے نکال کر سنجیدہ سوچ کی طرف لے جائے گا۔

غصہ آگ کی مانند ہے۔ یہ بھڑکانے سے مزید بھڑکتا ہے، نہ بھڑکایا جائے تو ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ جب غصہ میں آؤ تو کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ۔ یہ اصل میں غصہ کا ایک مجرب علاج ہے۔ اب سائنسی تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ غصہ کا آنا صرف پندرہ سیکنڈ کے لیے ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو نہ بھڑکائیں تو وہ پندرہ سیکنڈ کے بعد ختم ہو جائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تم بیٹھ جاؤ تو اس سے وہ پندرہ سیکنڈ کا وقت بیت جائے گا۔ اور اندر سے غصہ ختم ہو جائے گا۔ جس کے بعد اپنے جذبات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

غصہ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ الغضب جمرة من النار... وانما تطفأ النار بالماء ''غصہ آگ کی ایک چنگاری ہے... اسے پانی سے ٹھنڈا کرو'' (الآحاد والمثانی، رقم ۱۲۶۷) غصہ میں پانی پینا بھی وہی عمل کرتا ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے۔

غصہ کو قابو میں کر لینا دراصل یہ نہیں ہے کہ ہم نے غصہ تو ظاہر نہیں کیا، لیکن موقع آنے پر خوب انتقام لیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ غصہ بھی پی جاؤ اور انھیں معاف بھی کر دو:

اَلَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْـكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (آل عمران ۳:۱۳۴)

''وہ لوگ جو تنگی اور خوشحالی، دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔ اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ ایسے احسان کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔''

دوسرے موقع پر یوں فرمایا ہے کہ لوگوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دو:

اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ. (المومنون ۲۳:۹۶)

''ان کی برائی کا مقابلہ اس چیز سے کرو جو سب سے بھلی ہو۔''

نرمی

نرمی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اسی شخص میں پیدا ہو سکتا ہے جو دوسروں کی نیت کے بارے میں برا خیال نہ رکھتا ہو اور ان کے بارے میں بری باتیں نہ سوچتا رہتا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ:

لا تبلغوني عن اصحابي شيئا، اني أحب أن اخرج اليكم وانا سليم الصدر. (مصنف عبدالرزاق)

''مجھے میرے ساتھیوں کے بارے میں کوئی (بری) بات آکر نہ بتایا کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میں تم لوگوں کے پاس آؤں تو میرا دل تمھارے بارے میں صاف ہو۔''

یہ چیز دوسروں کے بارے میں رفق و محبت کو پیدا کرتی ہے۔ جو شخص رفق و نرمی سے محروم رکھا گیا ہے، وہ گویا تمام خیر سے محروم ہے، اس لیے کہ درشتی جو کہ نرمی کا الٹ ہے، آدمی کے لیے دوستی اور ہمدردی اور خیر خواہی کے سارے راستے بند کر دیتی ہے۔ اور خود آدمی اپنی درشتی کی وجہ سے حسن اخلاق پر قائم نہیں رہ سکتا۔

مغرور نہ ہونا

آدمی کو اللہ تعالیٰ اگر نعمتیں عطا کریں، اچھی شکل و صورت اسے ملی ہو، اعلیٰ صلاحیتوں سے اللہ

نے اسے نوازا ہو تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی مشکل میں صحیح رویہ اختیار کر لے اور اسے محسوس ہو کہ وہ آزمائش میں کامیاب ہوا ہے، تو یہ چیز بھی باعث تکبر و غرور ہو سکتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے موقعوں پر ہوشیاری سے اپنی حفاظت کرے۔

غرور و تکبر کا مطلب صرف اکڑ کر چلنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد دوسروں کو حقیر سمجھنا بھی ہے۔ مثلاً، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر آدمی اس شخص کو حقیر سمجھے جس کو اللہ ہی نے ان نعمتوں سے محروم رکھا ہے، تو یہ بات ایسی سنگین ہے کہ آدمی کو دوزخی بھی بنا دیتی ہے۔

غموں سے نجات: چند اچھی عادتیں

۱۔ نماز کی عادت پختہ کریں۔ اس کی حکمت ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔ اسے اپنے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنالو۔

۲۔ قرآن کی تلاوت سمجھ کر کریں۔ (النساء۴:۸۲)

۳۔ صبح کا استغفار (تہجد یا فجر میں)، گناہوں کا اعتراف و توبہ۔ (الذّٰریٰت ۵۱:۱۸)

۴۔ غور و فکر اللہ کی دنیا میں ہونے والے واقعات اور حادثات پر غور و فکر کر کے قرآن کی روشنی میں توجیہ۔ (آل عمران۳:۱۹۱)

۵۔ اچھے لوگوں کے ساتھ دوستی۔ (الکہف۱۸:۲۸)

۶۔ ذکر الٰہی (مشکلات و غم میں مسلسل اللہ کی طرف رجوع کے لیے)۔ (الاحزاب۳۳:۴۱)

۷۔ مشکلات میں دوسروں کی مدد۔

۸۔ اپنے آپ کو دوسروں کے لیے خیر و برکت بناؤ۔ (مریم۱۹:۳۱)

باب پنجم

مشکلات کے لیے دعائیں

[مشکلات آنے پر یا ان سے پہلے]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: 'أمن یجیب المضطر اذا دعاہ '، ''جب اللہ کو کوئی مجبور آدمی پکارتا ہے تو بھلا کون ہے اللہ کے سوا جو اس کا جواب دے گا۔'' (المعجم الکبیر ۶/۵۲) اس کے معنی یہ ہیں کہ مشکلات میں پھنسا ہوا بندہ جب اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور اس کی تکلیف کا ازالہ کر دیتا ہے۔ تکالیف میں خدا کو پکارنا پسندیدہ چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو 'الصمد' کہا ہے، جس کے معنی ہیں: ہر کسی کے لیے پناہ گاہ۔ جب ہم دعا کرتے ہیں تو دراصل اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ آیے چند ایسی دعائیں سیکھتے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں مختلف پریشانیوں کے مواقع پر کیں۔

یہ دعائیں حدیث سے لی گئی ہیں، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دنیا کی تکالیف کے ساتھ دین، ایمان اور خدا کے ساتھ صحیح تعلق کی استواری کے لیے دعائیں بھی ہیں۔ ہم جب دعا کرتے ہیں تو اپنی تکلیف اور پریشانی تک ہی محدود رہتے ہیں، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ساتھ دینی پہلو کو بھی جوڑ دیا ہے جس سے ان دعاؤں میں نہایت خوبی کے ساتھ دین اور دنیا کا توازن دیکھنے کو ملتا ہے۔

[ا]

اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَدَنِیْ اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ فِیْ سَمْعِیْ اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ

فِیْ بَصَرِیْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ.

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ.

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ.

اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِیْ إِلٰى نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَأَصْلِحْ لِیْ شَأْنِیْ كُلَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ. (سنن ابی داؤد، رقم ۵۰۹۰)

اے اللہ، میرے بدن میں راحت وعافیت دے، اے اللہ، میرے کانوں اور میری آنکھوں میں آرام دے۔ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

اے اللہ، میں کفر اور فقر سے تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

اے اللہ، میں عذاب قبر سے تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

اے اللہ، میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں، تو پلک جھپکنے کے برابر وقت کے لیے بھی مجھے میرے قابو میں نہ کر، میرے سارے کے سارے معاملے کو درست فرما دے۔ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

یہ پہلی دعا ہے۔ یہ چار دعاؤں پر مشتمل ہے۔ اس میں اپنے معاملات کی درستی کے لیے دعا ہے۔ جسم اور اس کے بعض حصوں کی عافیت کی دعا اس میں مانگی گئی ہے۔ غربت اور اس سے پیدا ہونے والی ناشکری سے پناہ مانگی گئی ہے۔

دنیا کی تکلیف آخرت کی تکلیف کی یاددہانی ہے، اس لیے عذاب قبر اور دوزخ کے عذاب سے بھی پناہ مانگی گئی ہے۔

تکلیف میں آدمی اپنے جذبات کی رو میں بہہ سکتا ہے۔ آخر میں یہ دعا کی گئی ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے اپنے جذبات کی رو میں بہنے نہ پاؤں۔

مختصر یہ کہ تکلیف میں دین، ایمان کی سلامتی اور تکلیف کے ازالہ کی دعا ہے۔

[۲]

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ. وَأَتُوْبُ إِلَیْهِ. (المستدرک، رقم ۲۵۵۰)

میں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ زندہ و قیوم ہے۔ میں اس کی طرف لوٹتا ہوں۔

تکالیف میں آدمی کو بہت سے مواقع پر محسوس ہوتا ہے کہ میرا ہی قصور تھا، اس موقع پر یہ دعا کرسکتا ہے۔

[۳]

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ. (بخاری، رقم ۲۷۳۶)

اے اللہ، میں غم اور حزن سے، عاجزی اور کسل مندی سے، بخیلی اور بزدلی سے، قرض کی کثرت اور قرض داروں کے دباؤ سے تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔

اس میں نفسیاتی امراض سے شفا کی دعا کی گئی ہے، جن میں غلط قسم کے غم، حزن، بے بسی کی کیفیت، حق گوئی یا حق کی ادائیگی کے معاملے میں بزدلی، عزیزوں اور غریبوں میں مال خرچ کرنے میں بخیلی سے پناہ مانگی گئی ہے۔

دعا کے آخر میں قرض سے نجات کی دعا ہے اور اس بات سے نجات کی دعا ہے کہ وہ لوگ میرے اوپر ہجوم کریں جن کا قرض میں نے دینا ہو۔

[۴]

اَللّٰهُمَّ إِنِّی عَبْدُكَ ابْنُ عَبْدِكَ ابْنِ أَمَتِكَ ، نَاصِيَتِی بِيَدِكَ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِی كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِی عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِی وَنُورَ بَصَرِی وَجِلَاءَ حُزْنِی وَذِهَابَ هَمِّی.

(صحیح ابن حبان، رقم ۹۷۲)

اے اللہ، میں تیرا بندہ، تیرے ایک بندے ہی کا بیٹا، اور تیری ایک بندی ہی کی اولاد ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرا حکم مجھ پر جاری ہے۔ (یعنی میں تیرا فرماں بردار ہوں،) میرے بارے میں تیرا ہر فیصلہ عادلانہ ہے (یعنی میں تیری لکھی ہوئی تقدیر پر راضی ہوں)۔ میں تیرے ہر اس نام کے واسطے سے تجھ سے جو نام تو نے اپنے لیے پسند کیا یا اس کو اپنی کسی کتاب میں نازل کیا یا اپنی خلق میں سے کسی کو سکھایا یا اسے اپنے غیب کے لیے ہی خاص رکھا، یہ سوال کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے لیے بادِ بہاری بنا دے، اسے میری آنکھوں کا نور بنا دے، میرے غم کو علاج بنا دے، اور میرے ملال کا مداوا بنا دے۔

اس میں خدا کے بارے میں غلط ردعمل سے بچنے کے لیے دعا کی گئی ہے۔ اس میں مشکل میں شکوہ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کی دعا ہے۔ آخر میں یہ دعا کی گئی ہے کہ اے اللہ، قرآن مجید کے علم کو میرے لیے مفید بنا دے تاکہ میں اپنے غم میں اس کی دی ہوئی بصیرت

اور فراست سے مدد لے کر تیرے اوپر ایمان کی پختگی پاؤں اور دنیا میں اپنی آزمائش میں کامیابی کے لیے ہدایت حاصل کروں۔ اس کے باوجود کہ مشکلیں مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں۔

[۵]

اَللّٰهُمَّ أَنتَ رَبِّى لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنتَ خَلَقْتَنِى وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِى فَاغْفِرْ لِى فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ. (بخاری، رقم ۵۹۴۷)

اے اللہ، تو ہی میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ تو میرا خالق ہے، سو میں تیرا بندہ ہوں۔ جس قدر ہمت ہے میں تیرے ساتھ اپنے وعدے اور معاہدے پر قائم ہوں۔ البتہ (جو خطا کروں) اس کی برائی سے تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ اپنے اوپر تیری نعمتوں کا پوری طرح اعتراف کرتا ہوں۔ اپنے گناہوں کا تیرے حضور میں اقرار کرتا ہوں، سو تو مجھے بخش دے۔ (تجھ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ) تیرے سوا گناہوں کو کوئی معاف نہیں کرسکتا۔

یہ توبہ اور گناہوں کے اعتراف کی دعا ہے تاکہ جن کوتاہیوں کی وجہ سے آفت آئی ہے، وہ بھی ٹل جائے اور آخرت میں بھی سرخ روئی حاصل ہو۔ دعا کے شروع میں اس بات کا اقرار ہے کہ اس مشکل کے باوجود اے اللہ میں تیرے ساتھ بندگی کے عہد پر قائم ہوں۔

[۶]

أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ. اَللّٰهُمَّ أَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ

هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ ما بَعْدَهَا اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَسُوءِ الْكِبَرِ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَعَذَابٍ فِي الْقَبْرِ. (مسلم، رقم ۲۷۲۳)

شام آئی ہم پر بھی اور خدا کے اس ملک (دنیا) پر بھی۔ خدا کا شکر، وہ اکیلا الٰہ ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اے اللہ، میں آپ سے اس رات کا خیر طلب کر رہا ہوں، اور اس رات میں ہونے والی برائی سے پناہ مانگتا ہوں، اور ہر اس بات کی برائی سے بھی پناہ چاہتا ہوں جو اس رات کے بعد ظاہر ہو۔ اے اللہ، میں کسل مندی اور بڑھاپے کی خرابی سے پناہ چاہتا ہوں۔ اور آگ کے عذاب اور قبر کی سختیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

اس میں خوف سے نجات کی دعا ہے جو مستقبل میں محسوس ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی کسل مندی سے پناہ مانگی ہے، جو دنیا کمانے اور نیکی کمانے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ کسل مندی کی آخری انتہا بڑھاپے کی ناتوانی ہے اس سے بھی پناہ مانگی ہے۔ بڑھاپے کی یاد موت کی یاد دلاتی ہے، اس لیے پھر مرنے کے بعد کی تکالیف سے نجات کی دعا مانگی ہے۔

[۷]

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيكَهُ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِي وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهِ وَأَنْ أَقْتَرِفَ عَلَى نَفْسِي سُوءًا أَوْ أَجُرَّهُ إِلَى مُسْلِمٍ. (ترمذی، رقم ۳۵۲۹)

اے اللہ، اے زمین و آسمان کے بنانے والے، اے وہ جو ہر چھپی بات کو بھی جانتا ہے اور ظاہری باتوں کو بھی، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں تو ہر چیز کا آقا و رب ہے، تجھ سے میں اپنے ہی شر سے پناہ چاہتا ہوں اور شیطان کی برائی اور شرکت سے بھی۔ اور اس بات سے بھی بچنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے لیے کوئی برائی کروں یا کسی دوسرے مسلمان سے۔

غم و غصے میں آدمی بسا اوقات اپنا نقصان کر لیتا ہے، اس چیز سے پناہ مانگی گئی ہے اور شیطان کے حملے سے، اس لیے کہ شیطان کے لیے ہمیں گمراہی پر ڈالنے کا بہترین موقع یہی غم و غصہ اور خوف وغیرہ کی حالت ہوتی ہے۔ پھر انسان اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ دعا کے آخر میں اس سے بھی پناہ کی دعا کی گئی ہے۔

[۸]

بِاسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْأَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ. وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (سنن النسائی الکبری، رقم ۹۸۴۳)

اس ذات کے نام سے جس کے سہارے کے ہوتے ہوئے کوئی چیز آسمانوں کی ہو یا زمینوں کی، نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ وہ ہر بات سننے والی اور ہر چیز کو جاننے والی ذات ہے۔

کسی ایسی چیز، شخص یا عمل جس سے نقصان کا اندیشہ ہو، اس سے پناہ اس انداز میں مانگی گئی ہے کہ اپنا عقیدہ بیان ہو گیا ہے کہ اللہ کے سہارے (اور) عنایت کے ہوتے ہوئے بھلا کون سی چیز اپنا برا اثر ڈال سکتی ہے۔ آخر میں مزید تسلی اس بات سے حاصل کی گئی ہے کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے، یعنی میری حالت سے بھی واقف ہے اور اس چیز سے بھی واقف ہے جس سے مجھے نقصان ہونے والا ہے۔

[۹]

أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ. (مسلم، رقم ۲۷۰۸)

میں اللہ کے احکامات کاملہ کے ذریعے سے ہر مخلوق کے شر کی پناہ چاہتا ہوں۔
یہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کی پناہ کی دعا ہے۔ اللہ کے کلمات سے مراد کلمہ کن جیسے الفاظ ہیں، یعنی میں چاہتا ہوں کہ اللہ میری حفاظت اور تکلیف دور کرنے کے لیے اپنے کلمہ کن سے میری مدد کرے۔

[۱۰]

اَللّٰهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيَا وَبِكَ نَمُوتُ وَإِلَيْكَ النُّشُورُ. (ابی داود، رقم ۵۰۶۸)

اے اللہ، ہم تیرے نام سے صبح کرتے اور تیرے نام سے شام کرتے ہیں۔ تیرے نام سے زندہ رہیں گے اور تیرے نام سے وفات پائیں گے اور جواب دہی کے لیے سب کو تیری طرف ہی جمع ہونا ہے۔
یہ بھی خدا کے فیصلوں پر راضی رہنے اور صبح و شام اللہ کی عنایتوں کو مانگنے کی دعا ہے۔

[۱۱]

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلِجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا. (ابی داود، رقم ۵۰۹۶)

اے اللہ میں تجھ سے داخل ہونے اور نکلنے کے مواقع کی بھلائی کا طلب گار ہوں، اللہ ہی کے نام سے ہم داخل ہوئے اور اللہ ہی کے نام سے ہم نکلے، اور ہمارا بھروسا اللہ رب العزت ہی پر ہے۔

یہ گھر یا دفتر یا کسی جگہ آتے جاتے وقت کی دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس جگہ جاتے وقت اور اس سے نکلتے وقت اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کاموں کے اندر شمولیت کے وقت بھی یہ دعا کی جا سکتی ہے۔

[۱۲]

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ. (مسلم، رقم ۲۷۲۵)

اے اللہ، مجھے ہدایت بخش اور میرے معاملے کو سیدھا کر دے۔

مشکل مواقع پر یا مشکل کاموں میں ہدایت اور معاملات کے صحیح ہونے کی دعا ہے۔

[۱۳]

اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ الْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ

اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَأَھْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَتِیْ وَآمِنْ رَوْعَاتِیْ

اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَأَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ.

(سنن ابی داؤد، رقم ۵۰۷۴)

اے اللہ، میں تجھ سے عافیت مانگتا ہوں، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اے اللہ، میں تجھ سے عفو و درگزر اور عافیت کا طلب گار ہوں، دینی اور دنیوی معاملات میں، اپنے گھر اور اپنے مال کے بارے میں، اے اللہ، میری کمزوریوں کو ڈھانپ اور میرے خوف و حزن کو مامون بنا دے۔

اے اللہ، مجھے میرے دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اوپر سے آنے والے خطرات

سے بچا اور میں اس سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ پاؤں کے نیچے سے اچانک حادثے کا شکار کر دیا جاؤں۔

اس دعا میں دنیا اور آخرت کی عافیت مانگی گئی ہے۔ پھر دین اور دنیا کی عافیت طلب کی گئی ہے۔ پھر اپنے گھر والوں کی صحت اور عافیت کی دعا ہے۔ پھر اپنے مال اور کاروبار کی عافیت کی دعا ہے۔ پھر رازوں اور کمزوریوں کے چھپانے کی دعا ہے۔

اس کے بعد یہ دعا کی گئی ہے کہ میرے غم اور خوف سے جو برائی میرے اوپر آسکتی ہے، اس سے مجھے نجات دے۔

اس کے بعد اپنے دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، بلکہ ہر طرف سے مشکلات اور آفات سے نجات کی دعا مانگی گئی ہے۔

[۱۴]

اَللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِىْ رُشْدِىْ وَأَعِذْنِىْ مِنْ شَرِّ نَفْسِىْ. (کنز العمال، رقم ۵۰۸۴)

اے اللہ، مجھے میری رشد و ہدایت الہام کر دے اور مجھے اپنی ہی خرابی سے بچنے کے لیے اپنی پناہ عطا کر۔

آدمی جہالت اور جذبات میں غلط راہ اختیار کر کے یا اپنے غلط اقدام سے اپنے لیے مصیبتیں کھڑی کر لیتا ہے، ان سے پناہ کی دعا کی گئی ہے کہ میں خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ مار لوں۔

کلمۂ آخر

ہم نے اس تحریر سے جو کچھ سیکھا ہے، وہ اصلاً یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری بھلائی کے لیے ہمیں مشکلات میں مبتلا کرتے ہیں۔ ہمیں ان آزمایشوں میں صبر و استقامت سے کام لے کر ان سے حاصل ہونے والے ثمرات اکٹھے کرنا چاہییں۔

قرآن مجید میں جن سنن الٰہیہ کا علم ہمیں سکھایا گیا ہے، ان میں سے ایک یہ سنت ابتلا بھی ہے جو ہم نے پچھلے صفحات میں سمجھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سنت کی شان دار حکمتوں کو سمجھ کر اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

قارئین سے التماس ہے کہ اگر وہ اپنی ذہنی پریشانیوں کا اس مختصر سی تحریر سے مداوا کر سکیں تو میرے لیے خدائے بزرگ و برتر سے عافیت دارین کی دعا کریں، اس لیے کہ یہ فقیر اس عافیت کا بہت محتاج ہے۔

اے اللہ، ہمارے لیے اس علم کو نافع بنا دے۔ آمین

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
اصول ومبادی	جاوید احمد غامدی	100روپے
دین حق	،	15روپے
اخلاقیات	،	135روپے
قانونِ عبادات	،	150روپے
قانونِ معاشرت	،	125روپے
قانونِ سیاست	،	35روپے
قانونِ معیشت	،	100روپے
قانونِ دعوت	،	120روپے
قانونِ جہاد	،	40روپے
حدود وتعزیرات	،	30روپے
خوردونوش	،	15روپے
رسوم وآداب	،	15روپے
قسم اور کفارۂ قسم	،	10روپے
برہان	،	225روپے
مقامات (مجلد)	،	180روپے
خیال وخامہ	،	200 روپے
مسئلۂ تملیک	امین احسن اصلاحی	60 روپے
رسول اللہؐ پر ایمان کے تقاضے	معز امجد	60 روپے
منہج انقلاب نبوی	،	20روپے
دلیل راہ	طالب محسن	300 روپے
فہم دین	محمد رفیع مفتی	300 روپے

کتاب	مصنف	قیمت
تصویر کا مسئلہ	محمد رفیع مفتی	80 روپے
رسول اللہؐ کے نکاح	،	40 روپے
نسخہ ہائے ناتمام	ساجد حمید	250روپے
بدگمانی کیا ہے؟ اس سے کیسے بچیں؟	،	60 روپے
ہم پر مشکلیں کیوں آتی ہیں؟	،	80 روپے
صبر کیا ہے؟ اسے کیسے حاصل کریں؟	،	90 روپے
Principles of Understanding Islam	جاوید احمد غامدی*	125روپے
The Religion of Islam	،	50روپے
Morals and Morality	،	130روپے
The Social Shari'ah of Islam	،	140روپے
The Political Shari'ah of Islam	،	100روپے
The Economic Shari'ah of Islam	،	70روپے
The Islamic Shari'ah of Preaching	،	120روپے
The Islamic Shari'ah of Jihad	،	100روپے
The Penal Shari'ah of Islam	،	100روپے
The Dietary Shari'ah of Islam	،	25روپے
Islamic Customs and Etiquette	،	25روپے
Oaths and their Atonement	،	15روپے
Selections from theTadabbur-i-Quran	،	150روپے
The Only Son offered for Sacrifice Isaac or Ishmael?	عبدالستار غوری	300روپے
Murder, Manslaughter and Terrorism	آصف افتخار	30روپے
Why Religion?	،	15روپے

* Rendered into English by: Shehzad Saleem

المورد 51K، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 092-42-583 4306, 586 5145
info@al-mawrid.org
www.al-mawrid.org

معالم السبیل

شاکلۂ انسانی کی فطری تشکیل

ہم پر مشکلیں کیوں آتی ہیں؟

ساجد حمید